Regd. L. No.7243

Phone. 8080[illegible]

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

اگست 1974

سرمایہ داروں کو وارننگ

اس مقام پر میں زمینداروں اور سرمایہ داروں کو بھی متنبہ کرنا چاہتا ہوں۔ وہ ایک ایسے فتنہ انگیز ابلیسی نظام کی رُو سے جو انسان کو ایسا بدمست کر دیتا ہے کہ وہ کسی معقول بات کے سننے کے لئے آمادہ ہی نہیں ہوتا' عوام کے گاڑھے پسینے کی کمائی پر رنگ رلیاں مناتے ہیں۔ عوام کی محنت کو غصب کر لینے کا جذبہ ان کے رگ و پے میں سرایت کر چکا ہے۔ میں اکثر دیہات میں گیا ہوں۔ وہاں میں نے دیکھا کہ لاکھوں خدا کے بندے ہیں جنہیں ایک وقت بھی پیٹ بھر کر روٹی نہیں ملتی۔ کیا اسی کا نام تہذیب ہے؟ کیا یہی پاکستان کا مقصد ہے! اگر پاکستان سے یہی مقصود ہے تو میں ایسے پاکستان سے باز آیا۔ اگر ان سرمایہ داروں کے دماغ میں ہوش کی ذرا سی بھی رمق باقی ہے تو انہیں زمانے کے بدلتے ہوئے تقاضوں کے ساتھ چلنا ہوگا۔ اگر انہوں نے ایسا نہ کیا تو ان کا خدا حافظ! ہم ان کی کوئی مدد نہیں کر سکتے۔ (آل انڈیا مسلم لیگ کے ۱۹۴۳ء کے سیشن میں قائداعظم کا خطاب)۔

شائع کردہ ادارہ طلوعِ اسلام - ۲۵ بی - گلبرگ - لاہور

قیمت فی پرچہ ایک روپیہ - پچاس پیسے

قرآنی نظام ربوبیّت کا پیامبر

ماہنامہ طلوع اسلام لاہور

ٹیلیفون
۸۰۸۰۰
خط و کتابت
ناظم ادارہ طلوع اسلام ۲۵۔بی گلبرگ ۲ لاہور

بدلِ اشتراک
پاکستان سالانہ ۱۵ روپے
غیر ممالک سالانہ ۱½ پونڈ

قیمت فی پرچہ
(۱½)
ڈیڑھ روپیہ

نمبر ۸	اگست ۱۹۷۴ء	جلد ۲۷

فہرست

(۱) لمعات ---------- ۲
(۲) ختم نبوّت اور تحریک "احمدیت" ---------- ۱۶
(۳) ذرا عمرِ رفتہ کو آواز دینا (۱۴ اگست کی یاد میں) --- ۱۷
(۴) طلوعِ اسلام کا مسلک و مقصد ---------- ۲۱
(۵) باب المراسلات ---------- ۲۳
(۶) حقائق و عبر ---------- ۲۶
(۷) خاندانی منصوبہ بندی — (پروفیسر رفیع اللہ شہاب) ۴۴
(۸) مجلسِ مذاکرہ ، طلوعِ اسلام کنونشن ۱۹۷۳ء --- ۴۹

ایڈیٹر محمد خلیل، ناشر سراج الحق، مقام اشاعت ۲۵۔بی گلبرگ ۲ لاہور، پرنٹر محمد محسن۔ لاہور آرٹ پریس انارکلی لاہور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

آئین پاکستان (۱۹۶۲ء) کی رُو سے ایک ادارہ کا وجود عمل میں لایا گیا جسے "اسلامی مشاورتی کونسل" کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ مقصد اس سے یہ تھا کہ قانون سازی کے سلسلے میں جو اہم معاملات درپیش ہوں ان کے متعلق وہ کونسل مشورہ دے کہ اسلامی نقطۂ نگاہ سے اِن کی پوزیشن کیا ہے۔ اس کونسل کا ایک ذیلی ادارہ بھی قائم کیا گیا جسے "ادارہ تحقیقاتِ اسلامی" کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے۔ اِس ادارہ کا مقصد اِسلام کے بنیادی مسائل سے متعلق تحقیقات کرنا تھا۔ اِس اجمال کی تفصیل کیا ہے؟ اِسے اِس ادارہ نے اپنے ترجمان کے ماہنامہ "فکر و نظر" کی جولائی ۱۹۶۷ء کی اشاعت میں خود ہی بیان کر دیا ہے۔ ہم مناسب سمجھتے ہیں کہ اسے انہی کے الفاظ میں پیش کر دیا جائے۔ ملاحظہ فرمایئے:۔

اِس ادارے کا ذکر کہیں چھڑ جائے تو نام کی نسبت سے اِس کے متعلق اکثر یہ سوال کیا جاتا ہے۔ کہ یہ "تحقیقاتِ اِسلامی" کیا چیز ہے، یہ ادارہ کس قسم کی تحقیق کرتا ہے، اِسلام میں تحقیق کا کیا مطلب ہے، اِسلام کوئی گمشدہ شے نہیں کہ اس کی تلاش کی ضرورت ہو۔ اِسلام میں کیا تحقیق ہو سکتی ہے۔ بجز اِس کے اِس کی مرمّت کی جائے اور غیر اِسلام کو عین اِسلام ثابت کیا جائے۔ اِسلام میں ایسی باتیں شامل کی جائیں۔ جو اِسلام نہیں ہیں، وغیرہ وغیرہ۔

قطع نظر اس سے کہ کسی علمی و دینی ادارے کے لئے یہ نام موزوں ہے یا نہیں، میں اِس وقت مختصراً اِس سوال کے متعلق کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ اِسلام میں تحقیقات کی کیا ضرورت ہے۔ اگر کسی بدبخت ازلی کا اسلامی علوم میں تحقیق سے مقصود یہ ہو کہ وہ تحقیق کے نام پر اِسلام میں غیر اِسلام کی پیوندکاری،

کرے یا اسلام کی نسبت دلوں میں شک اور بے یقینی پیدا کرے جیسا کہ بالعموم نام نہاد مستشرقین اور ان کے اعوان و انصار کرتے ہیں تو یہ بات بلاشبہ قابلِ صد ملامت بلکہ موجب رجم و لعنت ہے اور ایک مسلمان ملک میں کسی ایسے ادارے یا فرد کا وجود کسی درجے میں بھی گوارا نہیں کیا جا سکتا بالخصوص اگر وہ اسلام کے ساتھ اپنی نسبت بھی ظاہر کرتا ہو۔ لیکن یہ بات اپنی جگہ مسلم ہے کہ کسی مسلم سوسائٹی ملک یا قوم میں ایک ایسے ادارے کا نہ صرف جواز موجود ہے بلکہ یہ وقت کی ایک اہم ترین ضرورت ہے جہاں اسلامی علوم کے متخصصین اور عہدِ حاضر کے گوناگوں پیچیدہ نظریاتی، معاملاتی اور اخلاقی مسائل سے باخبر افراد کی ایک پوری جماعت دن رات گھنٹے پڑھنے بحث کرنے اور غور و فکر میں معروف ہو۔ نظریاتی کشمکش کے اس دور میں اسلام کو طرح طرح کے چیلنجوں کا سامنا ہے۔ علمی اور فکری سطح پر ہمیں بہت سے فتنوں کا مقابلہ کرنا ہے۔ اسلام دشمن قوتوں کے پھیلائے ہوئے بہت سے گمراہ کن خیالات کا ازالہ کرنا ہے۔ ان کے غلط پراپیگنڈوں کا توڑ کرنا ہے۔ مغربی افکار اور جدید تہذیب نے انسانیت کے لئے بالعموم اور مسلم معاشروں کے لئے بالخصوص جو متعدد فکری اور عملی مسائل پیدا کر دیئے ہیں۔ ان مسائل کا حل تلاش کرنا ہے اور بہت سی ایسی باتیں معاملات اور مسائل جو کل تک سامنے نہیں تھے اور جن کی بابت ہمارے پاس کوئی واضح حکم یا فیصلہ موجود نہیں ان کے متعلق اسلام کا نقطۂ نظر اور طرزِ عمل دریافت کرنا ہے۔ اسلام کے متعلق معاندین بہت سے بے سروپا الزامات عائد کرتے رہتے ہیں۔ موجودہ معیارِ علم و تحقیق کے مطابق ان کا جواب دینا بھی وقت کی اہم ضرورت ہے خود مسلمانوں میں طرح طرح کی عقیدہ و عمل کی گمراہیاں در آئی ہیں۔ بہت سی خرافات کو انہوں نے جزوِ اسلام بنا رکھا ہے۔ علم و تحقیق کے ذریعہ اسلام کو غل و غش سے پاک کر کے اس کی خالص اور منزہ صورت میں مسلمانوں کے سامنے پیش کرنا بجائے خود ایک بڑا اور ضروری کام ہے۔ یہ درست ہے کہ اسلام کو اللہ تعالےٰ نے قرآنِ کریم کی حفاظت کا سامان کر کے ہمیشہ کے لئے محفوظ کر دیا ہے۔ لیکن کیا یہ حقیقت نہیں کہ ہم نے قرآنِ حکیم کو ہی پس پشت ڈال دیا ہے اور اللہ کی رسّی کو مضبوطی سے تھامنے کی بجائے یکقلم چھوڑ دیا ہے۔ نتیجتاً طرح طرح کی گمراہیوں میں پڑ گئے ہیں۔ امتدادِ زمانہ سے اسلام کی سچی تعلیمات پر اوہام کے پردے پڑ گئے ہیں۔ حشو و زوائد کو اصل دین سے زیادہ اہمیت دی جانے لگی ہے۔ مختلف وادیوں میں بھٹکنے والی اس ملّت کو خالص دین کی اساس پر منظم کر کے ایک بنیان مرصوص بنانے کے کام کی ابتدا اسی طرح ہو سکتی ہے کہ سب سے پہلے ہم علم و تحقیق کے ذریعے اصل اسلام کو ان عناصر سے پاک کریں جن کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں اور جنہوں نے ملّت کو فرقوں اور جماعتوں میں بانٹ رکھا ہے یہ چند موٹی موٹی باتیں ہیں جو کسی بھی اسلامی ملک میں تحقیقاتِ اسلامی کے ایک ادارے کے قیام کا نہ صرف جواز پیش کرتی ہیں بلکہ تقاضا کرتی ہیں۔

کسی بھی ذی ہوش اور باخبر انسان کو ان مقاصد کی اہمیت سے انکار نہیں ہو سکتا۔ البتہ ملّت کے اجتماعی ضمیر کو ہر وقت یہ حق حاصل ہے کہ وہ احتساب کر کے دیکھے کہ ایک ادارہ جو ان مقاصد

کے لئے قائم کیا گیا ہے۔ اِن مقاصد کو کس حد تک پُورا کرتا ہے۔

"فکر و نظر" نے ادارے کے اِس عظیم کام کی تکمیل میں حالات کی نامساعدت کے باوجود حتی المقدور اپنا حصّہ ادا کرنے کی کوشش کی ہے اور آئندہ بھی کوشش کرتا رہے گا انشاء اللہ و باللہ التوفیق ۔

ہم اِس اقتباس کی طوالت کے لئے معذرت خواہ ہیں لیکن اسکے بغیر بات اچھی طرح واضح نہ ہو سکتی تھی۔ اِس میں اُن اہم موضوعات کا تذکرہ کرنے کے بعد، جو تحقیق طلب تھے، اِس ادارہ نے کہا ہے کہ۔(۱) ملت کے اجتماعی ضمیر کو ہر وقت یہ حق حاصل ہے کہ وہ احتساب کر کے دیکھے کہ ایک ادارہ جو اِن مقاصد کے لئے قائم کیا گیا ہے۔ اِن مقاصد کو کس حد تک پورا کرتا ہے۔

(۲) فکر و نظر نے ادارے کے اس عظیم کام کی تکمیل میں حالات کی نامساعدت کے باوجود حتی المقدور اپنا حصّہ ادا کرنے کی کوشش کی ہے۔

"فکر و نظر" نے اِس سلسلے میں اپنا حصّہ کیا ادا کیا ہے اسے تو چھوڑیئے — سوال یہ ہے کہ خود اس ادارہ نے اُن مقاصد کی تکمیل کے لئے اس - - - - - - - - - - - - - - - - -

- -

بارہ سال کے عرصہ میں کیا کیا ہے جو اس کے وجود کی وجہِ جواز ہیں۔ کچھ سال اُدھر اس ادارہ نے اپنے آمد خرچ کے سلسلے میں کچھ تفصیلات شائع کی تھیں۔ اگر ہمارا حافظہ غلطی نہیں کرتا تو اِن میں رواں خرچ کا سالانہ میزانیہ قریب بارہ لاکھ روپیہ بتایا گیا تھا۔ یہ بہت پہلے کی بات ہے اب شاید یہ میزانیہ کہیں زیادہ ہو گیا ہو گا۔ اس سے اندازہ لگ سکتا ہے کہ اِس بارہ سال کے عرصے میں اِس ادارہ پر قوم کا کس قدر روپیہ خرچ آ چکا ہے۔ یوں تو ملک میں متعدد شعبے ایسے ہیں جن میں اِس غریب قوم کی گاڑھے پسینے کی کمائی بُری طرح ضائع ہو رہی ہے لیکن جو ضیاعِ دولت و محنت، اِسلام کے نام پر ہو اُس سے بڑا صدمہ ہوتا ہے اور یہی صدمہ اِن سطور کی تسوید کا محرک ہے

اِس ادارہ کو چاہیئے تھا کہ خود ہی تفصیل سے بتاتا کہ جن مقاصد کی انہوں نے تفصیل دی ہے۔ اِن کی تکمیل کے لئے انہوں نے کیا کیا ہے۔ جہاں تک ہماری معلومات کا تعلق ہے اس نے اِس باب میں کچھ بھی نہیں کیا۔ ایسا کچھ ہم برائے تنقید و تنقیص نہیں کہہ رہے بلکہ بطورِ اظہارِ حقیقت کہہ رہے ہیں۔ ہم مثال کے طور پر بتلاتے ہیں کہ وہ کون سے اہم امور تھے جن کے متعلق بنیادی طور پر تحقیق کی ضرورت تھی اور اس کے بعد مختصراً عرض کریں گے کہ اِس سلسلہ میں اس ادارے نے کیا کیا ہے؛

۱۔ اِسلام کی صداقت کی بنیاد اس دعوے پر ہے کہ خدا کی کتاب (قرآن مجید) جو اُمت کے پاس موجود ہے حرفاً حرفاً وہی ہے جسے خدا نے بذریعہ وحی حضور نبی اکرمؐ کو عطا فرمایا۔ اگر قرآن مجید کے غیر محرف ہونے میں ذرا سا بھی شک و شبہ پیدا ہو جائے تو اِسلام کی صداقت کی ساری عمارت ڈھیر ہو کر رہ جاتی ہے۔

اس سے یہ اُسی سطح پر آجاتا ہے جس سطح پر سابقہ مذاہب، یہودیت، عیسائیت وغیرہ میں قرآن مجید کی جمع و تدوین و حفاظت کی جو تاریخ ہمارے ہاں مروج ہے اور جس کی بنیاد روایات پر ہے، اس کی رو سے کہا جاتا ہے کہ:-

۱۔ رسول اللہؐ نے قرآن مجید مرتب اور مدوّن شکل میں اُمت کو نہیں دیا تھا۔

۲۔ جنگِ یمامہ میں (جو حضرت ابوبکر صدیقؓ کی خلافت کے زمانے میں ہوئی تھی) بہت سے حفاظ شہید ہو گئے تو حضرت عمرؓ نے حضرت صدیق اکبرؓ سے کہا کہ اگر صورتِ حال یہی رہی تو ڈر ہے کہ کہیں قرآن مجید ضائع نہ ہو جائے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ اسے تحریری شکل میں جمع اور مرتب کر دیا جائے۔ حضرت صدیق اکبرؓ نے پہلے تو کچھ تامل کا اظہار کیا لیکن بعد میں وہ اس کے لئے آمادہ ہو گئے۔

۳۔ اس مقصد کے لئے حضرت زیدؓ بن ثابت کی زیرِ سرکردگی ایک کمیٹی قائم کی گئی جس نے لوگوں کو دعوت دی کہ جو کچھ کسی کے پاس قرآن کا موجود ہو وہ اُسے لے آئے۔ اس طرح ہڈیوں، پتوں، تختیوں پر لکھے ہوئے قرآن کے مختلف اجزاء جمع ہو گئے، جنہیں اُس کمیٹی نے مرتب کیا۔ بعض آیات ملتی نہیں تھیں انہیں بڑی تلاش بسیار حاصل کیا گیا۔ اس سعی و کاوش کے باوجود کم از کم دو آیات (آیۂ رضاعت اور آیۂ رجم) کہیں سے نہ مل سکیں ان کے متعلق حضرت عائشہؓ نے بتایا کہ وہ کھجور کے پتوں پر لکھی ہوئی رکھی تھیں۔ رسول اللہؐ کی وفات پر گھر میں جو کہرام مچا تو اُن پتوں کو بکری کھا گئی۔

بہرحال اس طرح قرآن مجید جمع اور مرتب کیا گیا۔ بعض روایات میں ہے کہ یہ کام زمانۂ خلافت حضرت عمرؓ میں سرانجام پایا تھا اور بعض کی رُو سے حضرت عثمانؓ کے زمانۂ خلافت میں۔

۴۔ حضرت عثمانؓ نے قرآن مجید کے مصدقہ نسخے مملکت کی مختلف ولایات میں بھیجے لیکن خود ان کے زمانے میں متعدد صحابہؓ کے پاس ایسے نسخے تھے جن میں بعض آیات، مصحفِ عثمانی سے مختلف تھیں۔ اسے "اختلافِ قرأت" کہا جاتا ہے۔ ان صحابہؓ کا یہ دعوےٰ تھا کہ یہ آیات دراصل اس طرح نازل ہوئی تھیں جس طرح ان کے نسخوں میں درج ہیں نہ کہ اُس طرح جس طرح مصحفِ عثمانی میں درج کی گئی ہیں۔ (تفصیل ان امور کی اُس مقالہ میں آچکی ہے جو طلوعِ اسلام کی اشاعت بابت جولائی ۱۹۷۶ء میں شائع ہو چکا ہے) یہ بھی کہا جاتا ہے کہ قرآن مجید کے مصدقہ نسخے حجاج بن یوسف نے مرتب کرائے تھے اور اُن نسخوں میں اور مصحفِ عثمانی میں کئی ایک مقامات میں اختلاف تھا اور اُمت کے پاس جو قرآن مجید موجود ہے وہ حجاج بن یوسف کے نسخوں کے مطابق ہے نیز یہ بھی کہا جاتا ہے کہ آیاتِ قرآنی پر نقطے اور اعراب بھی بعد میں لگائے گئے تھے۔ قرأتوں کے اختلاف کو بھی (جن کا ذکر اوپر کیا گیا ہے) آج تک تسلیم کیا جاتا ہے جن نسخوں کو حضرت عثمانؓ کی طرف منسوب کیا جاتا ہے یقینی طور پر نہیں کہا جاتا کہ وہ دنیا میں موجود ہیں اور موجود ہیں تو کہاں ہیں؟

یہ ہے مختصراً تدوین و جمع و حفاظتِ قرآن مجید کی وہ تفصیلات جو ہمارے ہاں متفقہ طور پر بیان اور تسلیم کی جاتی ہیں۔ ان کی رُو سے حفاظتِ قرآن مجید کا جو تصور سامنے آتا ہے وہ ظاہر ہے۔

جیسا کہ ہم نے شروع میں کہا ہے یہ سوال دین کی اصل بنیاد ہے۔ کیا ہم ادارہ تحقیقاتِ اسلامی سے دریافت

کرسکتے ہیں کہ انہوں نے اِس باب میں کوئی تحقیق کی اور اگر کوئی تحقیق کی تو وہ کیا ہے ؟ ہماری معلومات کے مطابق انہوں نے اس موضوع کو بغرضِ تحقیق چھُوا تک نہیں۔

۲۔ ہمارے ہاں عقیدہ یہ ہے کہ منزل من اللہ وحی کی دو قسمیں تھیں۔ ایک وحی متلو جو قرآن کریم کے اندر آ گئی اور، دوسری وحی غیر متلو جس کے مجموعہ کا نام احادیث ہے۔ اس عقیدہ کی رُو سے وحی کی حفاظت صرف قرآن مجید کی حفاظت تک محدود نہ رہی بلکہ دوسری قسم کی وحی کی حفاظت بھی اس کا غیر منفک حصہ قرار پا گئی۔ کیا ادارہ تحقیقاتِ اسلامی نے اِس باب میں بھی کوئی تحقیق کی ہے کہ یہ عقیدہ کہاں تک درست ہے اور اگر درست ہے تو اس حصۂ وحی کی جمع و تدوین و حفاظت کیلئے کیا کیا گیا۔ اور وہ کونسا نسخہ ہے جس کے متعلق بالتحقیق ثابت ہے کہ اس میں یہ دوسری قسم کی وحی مکمل اور غیر محرف شکل میں محفوظ ہے۔

۳۔ قرآن مجید میں انبیائے سابقہ اور اُمم گذشتہ کے احوال و کوائف تفصیلاً یا مجملاً مذکور ہیں۔ اکثر اعتراض کیا جاتا ہے کہ ان داستانوں کی تاریخی حیثیت مشکوک ہے۔ چونکہ قرآن کریم میں درج شدہ ایک ایک واقعہ کی صداقت پر ہمارا ایمان ہے اس لئے ہمارا فرض ہے کہ ہم تحقیق کے بعد ثابت کریں کہ یہ تمام سرگزشتیں شک و شبہ سے بالاتر ہیں۔ کیا ادارہ تحقیقاتِ اسلامی نے اس باب میں کچھ کیا ہے ؟

۴۔ قرآن مجید میں کائنات کے طبعی امور و قوانین فطرت کے سلسلے میں بھی بہت کچھ کہا گیا ہے۔ ان حقائق اور قوانین کی صداقت کا اثبات بھی ہمارا دینی فریضہ ہے۔ کیا اِس ادارہ نے اِس سلسلہ میں کوئی تحقیق کی ہے ؟

۵۔ دین کی بنیاد اس دعوے پر ہے کہ انسان صرف اس کے طبعی جسم سے عبارت نہیں۔ جسم کے علاوہ اس میں ایک اور شئے بھی ہے جسے نفس یا انسانی ذات کہا جاتا ہے۔ موت کے ساتھ انسانی جسم کا انتشار ہو جاتا ہے۔ لیکن انسانی ذات آگے بڑھ جاتی ہے اسے اُخروی حیات سے تعبیر کیا جاتا ہے جو ہمارا جزو ایمان ہے۔ اخروی زندگی کی کنہ اور ماہیت کے متعلق ہم کچھ نہیں جان سکتے لیکن قرآن کے اِس دعوے کا ثابت کرنا تو ہمارا فریضہ ہے کہ انسان صرف اُس کے طبعی جسم سے عبارت نہیں۔ اُس میں انسانی نفس بھی ہے۔ مغرب کے نظریہ مادہ پرستی اور اسلام کے تصورِ حیات میں یہ بنیادی فرق ہے۔ مادہ پرستی کا نظریہ اَب یورپ کی حدود سے آگے بڑھ کر باقی دنیا میں بھی سرایت کرتا چلا آ رہا ہے۔ خدا، وحی، آخرت، مکافاتِ عمل سے انکار اسی کے برگ و بار ہیں۔ کیا ہم پوچھ سکتے ہیں کہ اِس ادارہ نے اس سلسلے میں کیا تحقیق کی ہے ؟

۶۔ حضور نبی اکرمؐ شرف و مجد انسانیت کے معراجِ کبریٰ پر فائز تھے اور اسی جہت سے حضورؐ کی سیرت کو نوعِ انسان کے لئے اسوۂ حسنہ قرار دیا گیا ہے لیکن تاریخ و روایات کی رُو سے جو سیرت ہمارے سامنے آتی ہے اُس میں ایسے مقامات بھی پائے جاتے ہیں، جو شانِ رسالت مآبؐ کے یکسر منافی ہیں۔ کیا اِس ادارہ نے سیرت کی کوئی ایسی کتاب مرتب کی ہے، جو اِس قسم کے اسقامات سے پاک اور صاف ہو۔

۷۔ نبی اکرمؐ کے رفقاء (یعنی صحابہ کرامؓ) کے متعلق قرآنی سند موجود ہے کہ وہ پکے اور سچے مومن (مومن حق) تھے اور مومنین کی صفات و خصائص کا تذکرہ خود قرآن کریم میں پھیلا ہوا ہے۔ لیکن انہی صحابہ کبارؓ سے متعلق جو تاریخ ہمارے سامنے آتی ہے اُس میں ایسے ایسے واقعات ملتے ہیں جو صفاتِ مومنین کے یکسر نقیض ہیں

ان سے صحابہ کبارؓ کی جو سیرت سامنے آتی ہے وہ بڑی قابلِ اعتراض شکل اختیار کر لیتی ہے۔ کیا اس ادارہ نے اس عہد کی صحیح تاریخ مرتب کرنے کی کوئی کوشش کی ہے۔

ادارہ نے خود لکھا ہے کہ "مسلمانوں میں طرح طرح کی عقیدہ و عمل کی گمراہیاں در آئی ہیں۔ بہت سی خرافات کو انہوں نے جزوِ اسلام بنا رکھا ہے۔ علم و تحقیق کے ذریعے اسلام کو غلو و غش سے پاک کر کے اس کی خالص اور منزہ صورت میں مسلمانوں کے سامنے پیش کرنا ایک ضروری کام ہے۔" کیا ادارہ تحقیقاتِ اسلامی نے اس اتنے ضروری کام کے سلسلے میں اس بارہ برس کے عرصہ میں کچھ کیا ہے؟

۸۔ صدرِ اوّل کی تاریخ ہی کے سلسلہ میں ایک اور اہم گوشہ بھی تحقیق طلب ہے۔ حضور نبی اکرمؐ نے سب سے پہلی اسلامی مملکت قائم فرمائی جس کا دارالخلافہ مدینہ منورہ تھا۔ ۳۵ھ (یعنی حضرت عثمانؓ کی شہادت کے زمانہ) تک وہی دارالخلافہ رہا۔ اس دوران میں اس مملکت کی حدود افق تا افق پھیل گئی تھیں۔ کاروبارِ مملکت کی اس قدر وسعت کے پیشِ نظر حضرت عمرؓ نے خصوصیت سے سیکریٹریٹ (دیوان) قائم کیا تھا۔ ظاہر ہے کہ اس وسیع اور عظیم مملکت کے نظم و نسق کے سلسلے میں مدینہ میں وسیع پیمانے پر ریکارڈ رکھا گیا ہوگا۔ اس کے بغیر حکومت کا کاروبار چل ہی نہیں سکتا تھا۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس ریکارڈ کا ایک پرزہ بھی کہیں سے مل نہیں سکا۔ نہ ہی بعد کے کسی مؤرخ نے یہ کہا ہے کہ اس نے اس ریکارڈ میں سے کچھ نقل کیا ہے۔ ہماری ساری تاریخ زبانی روایات پر مبنی ہے۔ سوال تحقیق طلب ہے کہ اتنے عظیم ریکارڈ کو بالآخر ہوا کیا؟ اس چودہ سو سال میں نہ تو مدینہ منورہ میں کوئی ایسا زلزلہ آیا کہ یہ سارا ریکارڈ زمین میں دھنس گیا ہو۔ نہ کوئی ایسا سیلاب آیا کہ یہ طغیانیوں کی نذر ہو گیا ہو۔ نہ ایسی آگ ہی لگی کہ یہ جل کر ضائع ہو گیا ہو۔ نہ ہی کسی بیرونی طاقت نے حملہ کر کے اسے تاخت و تاراج کیا کہ باقی آثار کے ساتھ یہ ریکارڈ بھی تباہ ہو گیا ہو۔ مدینہ منورہ اس چودہ سو سال کے عرصے میں ہر آفت سے محفوظ رہا (اللہ تعالیٰ اسے قیامت تک محفوظ رکھے) اُمت کے وجود میں بھی تسلسل قائم رہا ان حالات کے پیشِ نظر کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ ریکارڈ کہاں چلا گیا۔ شہادت حضرت عثمانؓ کے بعد کوفہ اور دمشق اس مملکت کے مراکز قرار پائے۔ کہا جا سکتا تھا کہ یہ ریکارڈ اُدھر منتقل ہو گیا ہوگا۔ لیکن وہاں بھی اس کا کوئی سُراغ نہیں ملتا اگر وہ ریکارڈ موجود ہوتا تو آج ہماری تاریخ کچھ اور ہوتی اور بے شمار ایسے مسائل خود بخود حل ہو جاتے جو آج چیستان بنے ہوئے ہیں اور جس کی وجہ سے اُمت اس قدر انتشار کا شکار ہو رہی ہے۔ سوال یہ ہے کہ ہمارے ان تحقیقاتی ادارہ نے اس سمت کوئی قدم اٹھایا اور تحقیق کیا کہ یہ ریکارڈ کہاں گم ہو گیا؟

۹۔ ادارہ نے لکھا ہے کہ "اس دور میں اسلام کو طرح طرح کے چیلنجوں کا سامنا ہے۔ علمی اور فکری سطح پر ہمیں بہت سے فتنوں کا مقابلہ کرنا ہے۔ اسلام دشمن قوتوں کے پھیلائے ہوئے بہت سے گمراہ کن خیالات کا ازالہ کرنا ہے۔ ان کے غلط پراپیگنڈوں کا توڑ کرنا ہے"۔ کیا یہ ادارہ بتائے گا کہ اس نے اس سلسلے میں تحقیق و تفحص کے بعد کیا کچھ کیا ہے؟

۱۰۔ اب آگے بڑھیئے۔ اس ادارے کا قیام مملکتِ پاکستان کے ساتھ وابستہ ہے۔ اس مملکت نے اسلامی

ہونے کا دعوےٰ کیا ہے۔ اس سلسلے میں اِس ادارے پر بہت سی تحقیقاتی ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں۔ سب سے مقدم یہ کہ اِسلامی مملکت کا اصولی ڈھانچہ کس قسم کا ہوتا ہے جو اُسے غیر اِسلامی مملکتوں سے متمیّز کرتا ہے۔ اس کے بعد یہ متعین کرنا ضروری تھا کہ اِسلامی مملکت کا نظامِ حکومت کس قسم کا ہوگا۔ اس وقت معاشی نظام کے مسئلے نے دنیا میں ایک تحریک کی شکل ہی نہیں بلکہ ایک جدید مذہب کی صُورت اختیار کر رکھی ہے اور یہ چیلنج خود مملکتِ پاکستان کے سامنے بھی ہے۔ ہمارے ہاں یہ دعوےٰ کیا جاتا ہے کہ اِسلام ایک مکمل نظامِ معیشت رکھتا ہے جو دیگر معاشی نظاموں سے متمیّز ہی نہیں بلکہ اُن سب سے افضل اور اعلےٰ بھی ہے۔ کیا اِس ادارے نے اِسلام کے اِس معاشی نظام کا مکمل نقشہ مرتب کیا ہے؟۔

۱۱۔ مملکت کے سامنے سب سے مقدم کام ایک ضابطۂ قوانین کا مرتب کرنا تھا۔ اس سلسلے میں مسلمانانِ پاکستان کے مختلف فرقوں کی طرف سے ایسی تجاویز پیش ہوتی رہیں جن میں کہا یہ گیا کہ شخصی قوانین ہر فرقے کے الگ الگ ہوں اور پبلک لاز اُن کے فرقے کی فقہ کے مطابق رائج کئے جائیں۔ ظاہر ہے کہ ان تجاویز کی رُو سے مملکت کے لئے کسی متفق علیہ ضابطۂ قوانین کا مرتب ہونا ناممکنات میں سے ہے۔

مختلف فرقوں کے علمائے کرام نے یہ تجویز کیا کہ ملک کے قوانین کتاب وسنت کے مطابق ہونے چاہئیں۔ اِس شق کو آئین کے اندر بھی داخل کر دیا گیا لیکن قریب بیس سال کی بحث و جدل کے بعد محترم مودودی صاحب نے یہ فرمایا کہ :-

کتاب وسُنت کی رُو سے کوئی ایسا ضابطۂ قوانین مرتب نہیں کیا جا سکتا جو تمام فرقوں کے نزدیک متفق علیہ ہو۔

اِس کا نتیجہ یہ ہے کہ قانون سازی کے سلسلے میں ملک میں پہلا قدم بھی نہیں اٹھایا گیا۔ اسی سلسلہ میں منیر کمیٹی (۱۹۵۳ء) کے رُوبرو ہمارے علمائے کرام کی شہادات اس کمیٹی کی رپورٹ میں موجود ہیں اُن میں یہاں تک کہا گیا تھا کہ وضعِ قوانین تو ایک طرف، ہمارے ہاں سرے سے مجلس قوانین سازی کی ضرورت نہیں، اس لئے کہ (ان حضرات کے بیانات کے مطابق) ہمارے پاس قانون کا مکمل ضابطہ پہلے سے مدون شدہ موجود ہے جس میں نہ کسی تبدیلی کی اجازت ہو سکتی ہے نہ اضافہ کی ضرورت۔ ایک گروہ کے نزدیک یہ مکمل اور مدون ضابطۂ قوانین کتبِ احادیث کے اندر موجود ہے۔ دوسرے کے نزدیک کتبِ فقہ کے اندر۔ ان دونوں میں اختلاف کی صورت میں کہا گیا تھا۔ (اور اب بھی کہا جاتا ہے) کہ چونکہ ملک میں اکثریت حنفیوں کی ہے اس لئے مملکت کا فریضہ ہے کہ وہ فقہ حنفی کو قانونِ حکومت کی حیثیت سے نافذ کر دے۔ غیر حنفی حضرات کی طرف سے اس کے خلاف سخت احتجاج ہوا (اور ایسا ہونا چاہیئے بھی تھا) کیونکہ کوئی فرقہ کسی دوسرے فرقہ کی فقہ کو اِسلامی فقہ ماننے کے لئے تیار نہیں۔ نتیجہ یہ کہ قانون سازی کا سارا خواب کثرتِ تعبیر کی وجہ سے پریشان ہو کر رہ گیا۔ چنانچہ مملکت اس وقت اسی مقام پر کھڑی ہے اور اگر صورتِ حال یہی رہی تو قیامت تک اسی مقام پر کھڑی رہے گی۔ وہ مقام یہ ہے کہ شخصی قوانین ہر فرقہ کے اپنے اپنے ہیں اور ملکی قوانین (پبلک لاز) پارلیمان اُسی طریق سے وضع کرتی ہے جس طریق سے دنیا کی اور مملکتیں (مسلم اور غیر مسلم) اپنے اپنے ہاں وضع کرتی ہیں۔ البتہ آئین

مملکت میں یہ ضرور درج ہے کہ مملکت کا مذہب اسلام ہے اور یہاں کوئی ایسا قانون وضع اور نافذ نہیں ہو سکے گا جو کتاب وسنت کے خلاف ہو۔

ہم پوچھتے ہیں ادارہ تحقیقاتِ اسلامی سے — کہ جس کا وجود ہی اس آئین کا رہینِ منت ہے — کہ اس نے اس سوال کے متعلق کیا تحقیق کیا کہ ان حالات میں مملکتِ اسلامیہ جمہوریہ پاکستان میں قانون سازی کا کیا اصول اور طریق ہونا چاہیئے۔ کیا اُس کے نزدیک یہ سوال ایسا نہیں تھا کہ اور سب کچھ چھوڑ چھاڑ، سب سے پہلے اس کے متعلق تحقیق کیا جاتا؟

اس مملکت کی بنیاد نظریہ پاکستان اور دو قومی نظریہ پر ہے یہ کوئی چھپی ہوئی حقیقت نہیں کہ یہاں نظریہ پاکستان کے متعلق بھانت بھانت کی بولیاں بولی جارہی ہیں جن کی وجہ سے اس بنیادی نظریہ کا کوئی متعین مفہوم قوم کے سامنے نہیں آنے پاتا۔ حالانکہ دعوے ہر ذمہ دار فرد یا پارٹی کا یہی ہے کہ اس کا یہی فریضہ اس نظریہ کا استحکام اور فروغ ہے۔ کیا اس ادارے کے لئے ضروری نہیں تھا کہ وہ تحقیق کے بعد اس کا مفہوم متعین کرتا؟

جہاں تک مملکت کے دوسرے ستون — دو قومی نظریہ — کا تعلق ہے۔ تحریکِ پاکستان کے دوران ہر شخص کو معلوم تھا کہ اس سے مفہوم یہ ہے کہ ایک مملکت کے اندر بسنے والے مسلم اور غیر مسلم ایک قوم کے افراد نہیں ہو سکتے۔ مسلمان ایمان کے اشتراک کی بنیاد پر ایک الگ اور منفرد قوم ہیں۔ اور غیر مسلم اس اشتراک سے خارج ہونے کی وجہ سے دوسری قوم کے افراد۔ پاکستان میں مسلم اور غیر مسلم دونوں کو ایک قوم تصور اور تسلیم کرلیا گیا ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ "دو قومی نظریہ" کے الفاظ بھی برابر دہرائے جارہے ہیں۔ باہر تو کوئی اس سوال کو چھیڑتا تک نہیں لیکن کمروں کے اندر یہ کہا جاتا ہے کہ ہماری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ اگر غیر مسلموں کو الگ قوم قرار دے دیا جائے تو مملکت میں ان کی حیثیت کیا ہوگی؟

کیا ادارہ تحقیقاتِ اسلامی نے کبھی اس سوال پر بھی غور کیا اور قوم کو بتایا کہ اس باب میں اُن کی تحقیق کا نتیجہ کیا ہے؟ اسی سلسلے میں وہ بنیادی سوال بھی سامنے آتا ہے جس نے منیر کمیٹی کے دوران ہمیں دنیا کے سامنے اضحوکہ بنا دیا تھا۔ کمیٹی نے علمائے کرام سے یہ پوچھا تھا کہ مسلمان کسے کہتے ہیں۔ ان حضرات میں سے بعض نے تو اس کا کوئی جواب ہی نہیں دیا تھا اور جنہوں نے جواب دیا تھا۔ اُن میں سے کسی کا جواب دوسرے کے جواب سے ملتا نہیں تھا۔ نتیجہ اس کا یہ کہ یہ بنیادی سوال استفہامیہ نشان بن کر رہ گیا۔ یہ جو اس وقت "احمدیت" کے سلسلے میں ملک میں (بدقسمتی سے) ہنگامے برپا ہو رہے ہیں اس کی بنیادی وجہ بھی یہی ہے کہ مسلمان کی تعریف (DEFINITION) متعین نہیں کی گئی۔ کیا اس ادارہ کا یہ فریضہ نہیں تھا کہ وہ اس ہزار فتنہ در آغوش سوال کا جواب متعین کرتا؟

اسی سوال کے سلسلے میں ایک اور اہم سوال بھی سر اُٹھا لیتا ہے اور وہ یہ کہ ہمارے ہاں یہ عقیدہ عام ہے کہ اگر کوئی مسلمان (شومئی قسمت سے) اسلام ترک کردے تو وہ مرتد ہو جاتا ہے اور مرتد کی سزا قتل ہے "اسلام ترک کر دینے" سے مراد یہی نہیں کہ وہ ہندو یا عیسائی (وغیرہ) ہو جائے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ جس شخص کے عقائد ہمارے علما حضرات کے عقائد سے مختلف ہوں تو یہ اس پر کفر کا فتویٰ صادر کر دیتے ہیں اور اُن کی

تکفیر کی وجہ سے وہ مرتد قرار پا جاتا ہے۔ یہ فتوے اس قدر عام ہو چکے ہیں کہ مسلمانوں کا کوئی فرقہ ایسا نہیں جس پر دوسرے فرقوں نے کفر کا فتوے عائد نہ کر رکھا ہو۔ اس سلسلہ میں منیر کمیٹی کے ججوں نے بڑی دلچسپ بات کہی تھی۔ انہوں نے اس سوال کے جواب میں کہ مسلمان کسے کہتے ہیں جب علماء حضرات کی طرف سے مختلف بیانات ملے تو انہوں نے کہا کہ ہماری مشکل یہ ہے کہ اگر ہم ان میں سے کسی ایک جواب کو صحیح تسلیم کر لیں تو باقی فرقے ہمیں کافر قرار دے دیں گے اور اگر کسی کو بھی صحیح نہ مانیں تو ان سب کی طرف سے ہم پر کفر کا فتویٰ صادر ہو جائے گا۔
بالفاظِ دیگر اس وقت صورت یہ ہے کہ اگر کوئی مسلمان کسی ایک فرقے سے متعلق ہے تو اسے دوسرے فرقے کافر قرار دیتے ہیں اور اگر کوئی یہ کہہ دے کہ میں سیدھا سادا مسلمان ہوں، میرا تعلق کسی فرقے سے نہیں تو اس کے خلاف، تمام فرقوں کی طرف سے متفقہ طور پر کفر کا فتوے صادر ہو جاتا ہے۔
کیا ہمارے اس تحقیقاتی ادارہ کا یہ فریضہ نہیں تھا کہ وہ بیچارے مسلمانوں کے دامن کو ان خاردار جھاڑیوں سے چھڑانے کی کوئی صورت متحقق کرتا؟

۳۔ ہمارا دعوےٰ یہ ہے کہ اسلام نے عورت کو جو بلند مقام عطا فرمایا ہے۔ دنیا میں کسی مذہب یا قوم نے اُسے وہ درجہ نہیں دیا اور عملاً حالت یہ ہے کہ جس قدر مظلوم اور کسمپرس (عام) مسلمان عورت ہے۔ دنیا کی کسی مہذب قوم کی عورت شاید ہی ایسی مظلوم ہو۔ کیا اس ادارے نے اس سوال کو بھی درخورِ اعتنا سمجھا کہ وہ یہ متعین کرے کہ اسلام میں عورت کا صحیح مقام کیا ہے اور اس کے حقوق اور ذمہ داریاں کیا۔ صدر ایوب (مرحوم) کے زمانہ میں اس سوال نے عملی شکل اختیار کر لی تھی جب محترمہ مس فاطمہ جناح (مرحومہ) منصبِ صدارت کے لئے بطور امیدوار کھڑی ہوئیں اور یہ سوال پیدا ہوا کہ اسلام کی رُو سے عورت سیاسیات میں حصہ لے سکتی ہے یا نہیں۔ اس زمانے میں اس سوال کا نفی اور اثبات میں جواب دینے والوں کے درمیان جو نزاع پیدا ہوئی تھی۔ اس کی یاد اب تک تلخی کام و دہن کا موجب بن جاتی ہے۔ کیا اس ادارے نے اس سوال کو بھی اپنی تحقیق کا موضوع بنایا تھا؟

۴۔ ہمارے ہاں ہر شخص یہ رونا روتا ہے کہ قوم کا نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ اسلام سے بیگانہ ہی نہیں، متنفر ہو رہا ہے۔ وہ کمیونزم کی ملحدانہ آغوش میں چلا جا رہا ہے۔ قانون کا احترام اُس کے دل سے اٹھ چکا ہے۔ وہ اسلامی اقدار اور روایات سے سرکشی اختیار کر رہا ہے، ہر شخص یہ رونا روتا ہے اور قوم متفقہ طور پر کہہ رہی ہے کہ اس کا بنیادی سبب وہ غلط تعلیم ہے جو انہیں ہماری درسگاہوں میں دی جاتی ہے۔ خواہ وہ مذہبی مکاتب ہوں یا سکول اور کالج۔ یہ نتیجہ جس پر قوم پہنچی ہے، بالکل صحیح اور درست ہے۔ سب سے پہلے تو یہ کہ مذہبی تعلیم اور دنیاوی تعلیم کی ثنویت، اسلام کے بنیادی تصور کے خلاف ہے۔ اسلام میں دنیا اور دین میں تفریق ہے ہی نہیں لہٰذا کوئی نظامِ تعلیم جس میں مذہب کی تعلیم الگ دی جائے اور دنیاوی علوم کی تعلیم الگ (خواہ وہ الگ الگ درسگاہوں میں ہو یا اسلامیات کا الگ مضمون پڑھانے کی شکل میں) اسلامی نتائج پیدا کر ہی نہیں سکتی۔ پھر ہمارا مذہبی نظامِ تعلیم ہو یا دنیاوی، وہ مذہب یا امورِ دنیا کے متعلق کچھ معلومات تو مہیا کر دیتا ہے، تعلیم کے حقیقی مقصد کے لئے کچھ نہیں کر پاتا۔ تعلیم کا حقیقی مقصد

یہ ہے کہ فرد کے اندر جو انسانی صلاحیتیں مضمر ہیں وہ اُنکی نشو و نما کر دے اور اسلامی تعلیم کا مقصد یہ ہے کہ وہ طالبعلم کو اس قابل بنا دے کہ وہ ان صلاحیتوں کو اقدارِ خداوندی کے مطابق صَرف میں لائے۔ ظاہر ہے کہ جو نظامِ تعلیم ان مقاصد کے حصول کا ذریعہ بنے گا وہ دیگر نظامہائے تعلیم سے یکسر مختلف اور منفرد ہو گا۔ ہماری نئی نسل کے قلب و دماغ کو دین کے سانچوں میں ڈھالنے کے لئے ضروری تھا کہ یہاں اس قسم کا نظامِ تعلیم وضع اور نافذ کیا جاتا۔ یہ فریضہ تحقیقاتِ اسلامی سے متعلق ادارہ کا تھا۔ کہ وہ اس نظامِ تعلیم کا (کم از کم) ہیولیٰ تیار کرتا۔ کیا ادارۂ تحقیقاتِ اسلامی نے اس سلسلہ میں کچھ کیا ہے؟

۱۵۔ آئینِ پاکستان کی اصولی ہدایات میں کہا گیا ہے کہ مملکت کا فریضہ ہوگا کہ وہ مسلمانوں کو اسلامی اصولوں کے مطابق زندگی بسر کرنے کے قابل بنا دے اور معاشرہ کو اسلامی قالب میں ڈھال دے۔ یہ الفاظ ایسے ہیں جن کا کوئی متعین مفہوم کسی کے سامنے نہیں۔ اس سلسلے میں کسی بڑے سے بڑے دانشور سے بھی بات کی جائے تو وہ چند اخلاقی محاسن گنا دے گا ــ مثلاً جھوٹ نہ بولو، چوری نہ کرو، کسی کو دھوکہ نہ دو، اذیت نہ پہنچاؤ وغیرہ وغیرہ۔ یہ وہ اخلاقی محاسن یا پابندیاں ہیں جنہیں دنیا کی ہر قوم صحیح تسلیم کرتی ہے۔ حتیٰ کہ جو لوگ خدا تک کے منکر ہیں وہ بھی عام طور پر ان ضوابط کا اعتراف کرتے ہیں۔ پہلا سوال یہ پیدا ہوتا ہے۔ کہ اگر اسی قسم کے اخلاقی ضوابط کی پابندیوں کا نام اسلامی زندگی ہے تو پھر اس نقطۂ نگاہ سے مسلم اور غیر مسلم میں فرق کیا ہے۔ ان اخلاقی پابندیوں سے تو ہمارا ہمسایہ ملک ہندوستان بھی انکار نہیں کرتا حالانکہ ہم اُن سے الگ ہی اس بنیاد پر ہوتے تھے کہ وہاں رہتے ہوئے ہم اسلامی زندگی بسر نہیں کر سکتے تھے۔ اگر اسلامی طرزِ زندگی کے متعلق علمائے کرام سے پوچھا جائے تو وہ کہہ دیں گے کہ نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ وغیرہ ارکانِ اسلامی کی پابندی کا نام اسلامی طرزِ زندگی ہے۔ سوال یہاں پھر وہی پیدا ہوتا ہے کہ ان ارکان کی ادائیگی کی اجازت تو مسلمانوں کو ہندوستان میں بھی حاصل تھی اور اب بھارت میں بھی حاصل ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ (اس جواب کی رو سے) ہم ہندوستان میں رہتے ہوئے بھی اسلامی طرز کی زندگی بسر کر سکتے تھے۔

یہ اور اسی قسم کے اور سوالات ہیں جو ہمارے ہاں عام طور پر اٹھائے جاتے ہیں اور جو بالخصوص ہماری نئی نسل کو متاثر کر رہے ہیں۔

کیا ادارہ تحقیقاتِ اسلامی کا فریضہ نہیں تھا کہ وہ متعین کرے کہ اسلامی طرزِ زندگی کسے کہتے ہیں اور اسلامی معاشرہ کا انداز کیا ہوتا ہے۔ نیز یہ بھی کہ وہ اس کا جواب دے کہ اس طرزِ زندگی کو ہم ہندوستان میں رہتے ہوئے کیوں اختیار نہیں کر سکتے تھے اور اس کے لئے اپنی آزاد مملکت کی ضرورت کیوں تھی۔

اس ضمن میں ایک اور سوال بھی تحقیق طلب ہے وہ یہ کہ ہم میں سے ہر شخص اعتراف کرتا ہے کہ جھوٹ بولنا بُرا ہے، چوری نہیں کرنی چاہیئے، دھوکہ نہیں دینا چاہیئے، فریب کاری سے کام نہیں لینا چاہیئے وغیرہ وغیرہ۔ اس اعتراف کے باوجود سارا معاشرہ ان اخلاقی جرائم کی رو میں بہے چلا جا رہا ہے۔ سوال غور طلب یہ ہے کہ ان اخلاقی پابندیوں کے اعتراف کے باوجود ان پر عمل کیوں نہیں ہو رہا؟ اس کے اسباب اور وجوہ کیا ہیں؟ اس سلسلے میں ہم دیکھ چکے ہیں کہ نہ تو وعظ و نصیحت کوئی نتیجہ مرتب کرتی ہے نہ ہی ملکی قوانین کارگر ثابت ہو رہے ہیں۔ جب صورت یہ ہے تو ہمیں اس معاشرہ کی تشکیل کی تدبیر کیا ہے جس میں یہ کچھ نہ ہو سکے جب

پرست طبقہ کی طرف سے تو اس کا اتنا ہی جواب دیا جاتا ہے کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہاں شرعی سزائیں نافذ نہیں کی گئیں۔ لیکن جن ممالک میں شرعی سزائیں نافذ ہیں، جو دیدہ ور وہاں کے معاشرہ کا گہری نظروں سے مطالعہ کر آئے ہیں وہ جانتے ہیں کہ وہاں کس قسم کے اور گھناؤنے عیوب کارفرما ہیں۔ پھر ایک بات تو بالکل واضح ہے۔ ہمارے ہاں جرم قتل کی شرعی سزا تو نافذ ہے ــ سزائے موت ــ سوچیے کہ محض یہ سزا اس جرم کے ارتکاب کی روک تھام میں کس حد تک کارگر ثابت ہوئی ہے؟ مجرم قتل کے مرتکب حوالۂ دار و رسن بھی کئے جاتے ہیں اور جرم ہے کہ وبا کی طرح پھیلتا چلا جا رہا ہے۔ جرائم کی سزا ضروری ہے لیکن تجربہ بتاتا ہے کہ محض سزا سے جرائم کا استیصال نہیں ہو سکتا۔ تحقیق طلب سوال یہ ہے کہ ان حالات میں معاشرہ کی اصلاح کی عملی صورت کیا ہے اور اسے اسلامی قالب میں ڈھالنے کا طریق کیا؟ کیا ادارہ تحقیقات اسلامی نے کبھی اس سوال کو بھی درخورِ توجہ خیال کیا ہے؟

یہ ہیں اُن مہمات مسائل کی چند ایک مثالیں جن پر اسلامی نقطۂ نگاہ سے تحقیق کرنے کی ضرورت تھی اور یہی ہمارے نزدیک ادارہ تحقیقات اسلامی کا اولین فریضہ تھا۔ اس ادارہ نے جو نام نہاد "تحقیقاتی" امور سرانجام دیئے ہیں۔ وہ کوئی سربستہ راز نہیں۔ جن سے باہر کی دنیا واقف نہ ہو سکے۔ انہوں نے اس بارہ سال کے عرصے میں ماہوار رسالہ (فکر و نظر) شائع کیا ہے اور چند ایک کتابیں۔ اس ماہنامہ میں جس نوعیت کے مضامین شائع ہوتے ہیں۔ ان کا تجزیہ اور تنقید بڑی تفصیل کی متقاضی ہے جس کے لئے فرصت درکار ہے۔ لیکن فی الجملہ اتنا کہا جا سکتا ہے کہ اس میں ان مسائل میں سے کسی ایک پر بھی کوئی تحقیقاتی کام سامنے نہیں آیا۔ جہاں تک ادارہ کی طرف سے شائع ہونے والی کتابوں کا تعلق ہے۔ تعداد کے لحاظ سے تو وہ اچھی خاصی ہیں لیکن تحقیقاتی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے۔ تو اُن کا کوئی خاص وزن نہیں اُن میں سے بیشتر یا تو دوسری زبانوں میں لکھی ہوئی کتابوں کے تراجم ہیں اور یا اُن کتابوں سے اخذ کردہ ملفوظات، جن کا تعلق ہمارے ہاں کے عملی مسائل سے بہت کم ہے۔ مثلاً "مسائلِ تصوف" پر مشتمل رسالہ تشیریہ (عربی اور اردو) امام رازی کی کتاب النفس والروح (عربی) امام شافعی کی کتاب الرسالہ کا اردو ترجمہ۔ امام محمدؒ کی کتاب دوائے شافی کا اردو ترجمہ (امام ابو عبید کی کتاب الاموال کا اردو ترجمہ (دو ضخیم جلدوں میں) کتاب اختلاف الفقہا (غالباً عربی متن بلا ترجمہ) امام رازی کی کتاب علم الاخلاق جالینوس کے نظریۂ حکمت کے خلاف۔ الیگزینڈر کا نظریہ (انگریزی) وغیرہ۔

ایک سلسلۂ تالیفات "مجموعہ قوانین اسلام" کے نام سے جاری ہے۔ اس وقت تک اس کی چار جلدیں شائع ہو چکی ہیں۔ اس مجموعہ میں اس کے سوا کچھ نہیں کہ ہماری فقہ کی کتابوں سے خوشہ چینی کر کے انہیں الگ الگ جلدوں میں جمع کر دیا گیا ہے۔ کتب قوانین کے سلسلے میں ایک دلچسپ چیز سامنے آتی ہے۔ قانونِ طلاق پر ایک کتاب، انگریزی زبان میں شائع ہوئی ہے جس کی قیمت ۷۵ روپے ہے۔ طلاق کا قانون جو قرآنِ کریم کی چار آیتوں میں مذکور ہے اس پر جو تحقیق انیق کی گئی ہے وہ ایک ایسی ضخیم جلد میں

سمائی ہے جس کی قیمت پچھتر روپے ہے۔ یاللعجب! کتب قوانین کے سلسلہ میں اتنا واضح کر دینا ضروری ہے۔ کہ یہ کتابیں علمی اور نظری اعتبار سے کتنی ہی اہم کیوں نہ ہوں ان کی عملی حیثیت یہی ہے کہ فلاں مصنف کی ان قوانین کے متعلق یہ رائے تھی، یا فلاں مملکت نے فلاں قانون کو اس شکل میں رائج کیا تھا۔ یہ قوانین نہ تو احکام قرآنیہ کی طرح حرفِ آخر قرار پا سکتے ہیں نہ غیر متبدل۔ اسلامی مملکت اپنے سب قوانین آپ وضع کرتی ہے۔ ایسا کرنے میں وہ ان کوششوں سے مستفید ضرور ہوتی ہے جو اس ضمن میں پہلے کی گئی ہوں۔ لیکن وہ اس مملکت کے لئے اتھارٹی یا (BINDING) نہیں ہو سکتیں۔ لہٰذا ادارہ تحقیقاتِ اسلامی نے اس سلسلہ میں جو تراجم شائع کئے ہیں یا ان کتابوں سے اخذ کردہ تالیفات، تو ان کی حیثیت تاریخ فقہ کی سی ہے، نہ کہ ایک اسلامی مملکت کے لئے ضابطہ قوانین کی سی۔ تحقیق سے مراد یہ تھی/یہ بتایا جائے کہ مملکتِ پاکستان نے قانون سازی کے سلسلہ میں جو آئینی، پابندیاں اپنے اوپر عائد کی ہیں۔ ان کی روشنی میں ہمارا ضابطہ قوانین کس قسم کا ہونا چاہیئے اور اسے مرتب کس طرح کیا جا سکے گا۔

بہر حال ہم یہاں ادارہ کی طرف سے شائع کردہ بعض کتابوں کا سرسری سا تعارف پیش کر سکتے ہیں، تفصیل میں جائیں تو۔ سفینہ چاہیئے اس بحرِ بیکراں کے لئے۔

یہ ہے ماحصل اُس ادارہ کی بارہ برس کی تحقیقاتی کاوشوں کا جہاں (خود فکر و نظر کے الفاظ میں) اسلامی علوم کے متخصصین اور عہدِ حاضر کے گوناگوں پیچیدہ نظریاتی معاملاتی اور اخلاقی مسائل سے باخبر افراد کی ایک پوری جماعت دن رات لکھنے، پڑھنے، بحث و تمحیص اور غور و فکر میں مصروف (ہے)

ہم نے اس ادارہ کی کارکردگی کا یہ سرسری سا محاسبہ اس لئے کیا ہے کہ خود اس ادارہ نے اس کی دعوت دی ہے۔ اگر ہمارا یہ محاسبہ درست نہیں تو ہم اس ادارہ سے درخواست کریں گے کہ جن مسائل کی ہم نے مثالیں دی ہیں وہ تفصیل سے بتائے کہ ان کے متعلق اُس نے کیا کیا تحقیقاتی کام کئے ہیں۔ اور ان کا ماحصل کیا ہے؟ اگر وہ اس کا جواب طلوعِ اسلام میں شائع کرنا چاہیں تو اس کے صفحات بھی اس کے لئے کھلے ہیں، ورنہ ان کا اپنا ماہنامہ تو ان کے پاس موجود ہی ہے۔ واضح رہے کہ ہمیں اس ادارہ سے کوئی ذاتی مخاصمت ہے نہ افرادِ ادارہ سے کوئی شخصی کد۔ ہم تو اُن میں سے دو چار کے سوا کسی کا نام تک بھی نہیں جانتے۔ ہمارے اس محاسبہ کا جذبۂ محرکہ صرف یہ ہے کہ قوم کو کتنے اہم مسائل درپیش ہیں۔ اس نے ایک پوری جماعت کو فکرِ روزگار سے بے نیاز کر کے اُس کے سپرد یہ کام کیا کہ وہ ان مسائل سے متعلق تحقیق کر کے اُسے بتاتے کہ اسلامی نقطۂ نگاہ ان کی پوزیشن کیا ہے؟ اس جماعت نے اگر اس فریضہ کو سرانجام نہیں دیا تو اس غریب قوم کا جس قدر روپیہ ضائع ہوا وہ تو ایک طرف ان مسائل کے حل نہ ہونے سے جس قدر ناقابلِ تلافی نقصان ہوا اس کا اندازہ ہی نہیں لگایا جا سکتا اگر یہ ادارہ اپنی ذمہ داریوں کا احساس کرتا اور ان مسائل کو حل کر دیتا تو قوم اس وقت اُس پریشانی فکر و نظر کا شکار نہ ہوتی جس کی وجہ سے یہ اس قدرِ خلفشار کے گرداب میں پھنسی ہوئی ہے۔ اس بھول بھلیاں سے نکلنے کا کوئی راستہ نظر نہیں آتا۔ نتیجہ اس کا یہ کہ قوم کا نوجوان طبقہ اس خیال کو دل میں راسخ کئے جا رہا ہے کہ اسلام آج سے چودہ سو سال پہلے کے مسائل کا حل پیش کر سکا ہو تو اور بات ہے، لیکن اب تو اس کی حیثیت ایک "چلے ہوئے کارتوس"

سے زیادہ کچھ نہیں۔ اب وہ زندگی کے عملی مسائل کا حل پیش کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ یہ ایسا نقصان ہے جس کی تلافی ہی نہیں ہو سکتی اور جو افراد یا ادارے، بالواسطہ یا بلاواسطہ اس کے ذمے دار ہیں (یعنی قوم نے جنہیں یہ ذمہ داری سونپی تھی) وہ ایسے جرم کے مرتکب ہوئے ہیں جس کے اثرات صدیوں تک مٹائے نہیں جا سکیں گے۔

---

(۲)

مرکزی حکومتِ پاکستان نے اس سوال کو، کہ رسول اللہ کے بعد اجرائے نبوت ماننے والوں کی آئینی حیثیت کیا ہے۔ آیا وہ غیر مسلم ہیں یا نہیں ایک کمیٹی کے سپرد کر دیا ہے۔ جو وفاقی پارلیمان کے جملہ ارکان پر مشتمل ہے۔ اس کمیٹی نے اپنے میں سے ایک خصوصی کمیٹی کا تعین کیا ہے، اور خصوصی کمیٹی نے ایک رہبر کمیٹی کا۔ اس وقت یہ کمیٹیاں مختلف تجاویز اور قراردادوں پر غور و خوض کر رہی ہیں۔ آخر الامر یہ سوال وفاقی پارلیمان میں زیر بحث آئے گا کیونکہ وہی ادارہ ان کی قانونی حیثیت متعین کرنے کا مجاز ہے۔ حکومت نے اس مسئلہ کے حل کے لئے جو طریق کار بھی مناسب سمجھا ہے ٹھیک ہے۔ اصل سوال تو اس کے حل یا نتیجہ کا ہے جس کا قوم کو انتظار ہے۔

اس دوران میں صوبائی حکومت پنجاب نے خصوصی احکامات نافذ کئے ہیں۔ جن کی رُو سے اِس مسئلہ کے متعلق ہر قسم کے مواد کی طباعت و اشاعت پر پابندی عائد کر دی ہے۔ مقصد اس سے ملک میں نظم و ضبط کا برقرار رکھنا ہے۔ اس مقصد کے حصول کے لئے حکومت جو تدابیر بھی اختیار کرے اس کے مصالح اور تقاضوں کی وہی بہترین جج ہو سکتی ہے۔ طلوعِ اسلام قانون شکنی اور فساد انگیزی کی مخالفت کرتا چلا آرہا ہے۔ اور اب بھی اس کی پر شدت سے مخالفت کرتا ہے۔

لیکن ان پابندیوں کی وجہ سے ایک نقصان ایسا ہو رہا ہے جس کی طرف حکومت کی توجہ مبذول کرانا ہم اپنا فریضہ سمجھتے ہیں پارلیمانی کمیٹی نے جن اداروں اور تنظیموں سے بیانات حاصل کئے ہیں۔ ان میں سرفہرست صدر انجمن احمدیہ (ربوہ) اور امیرِ جماعت احمدیہ (لاہور) کے نام آتے ہیں۔ ہم نہیں جانتے کہ انہوں نے اپنے بیانات میں مرزا صاحب کے دعاوی اور اپنے مؤقف و مسلک کے متعلق کیا کہا ہے۔ کیونکہ انہیں شائع نہیں کیا گیا، لیکن تجربہ اس پر شاہد ہے کہ یہ حضرات ان دعاوی و عقائد کو اپنے رنگ میں پیش کیا کرتے ہیں۔

ارکان پارلیمان کتنے ہی دانشور سہی لیکن ہم نہیں سمجھتے کہ "احمدیت" کے متعلق لٹریچر پر انہیں اتنا عبور حاصل ہو گا کہ وہ ان بیانات کا صحیح صحیح جائزہ لے سکیں۔ یہ ایک خصوصی موضوع ہے جس کے لئے خصوصی مطالعہ و تحقیق کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر ملک میں مرزا صاحب کے دعاوی اور احمدیوں" (اہل ربوہ اور لاہوری جماعت) کے عقائد کے متعلق کتابوں اور مقالوں کی اشاعت کی اجازت ہوتی، تو پارلیمانی کمیٹی کے سامنے ایسا مواد آسکتا تھا جس کی روشنی میں انہیں حقیقت تک پہنچنے میں آسانی ہو جاتی۔ اگر پارلیمانی کمیٹی کے ارکان عدم واقفیت یا معلومات کی کمی کے باعث غلط نتیجہ پر پہنچ گئے تو اس کے اثرات و نتائج جس قدر دُور رس ہو سکتے ہیں ظاہر ہے۔ وقت اگرچہ کم ہے (اور جب یہ پرچہ شائع ہو گا تو وہ اور بھی کم رہ جائے گا) لیکن اس کے باوجود ہم حکومت سے،

درخواست کریں گے کہ وہ (کم از کم) اس موضوع پر مقالات اور کتابوں کی اشاعت پر سے پابندی اٹھا لے اور اور ربوہ اور لاہوری جماعتوں کے سربراہوں کے بیانات شائع کر دے اور ملک کے اہلِ علم حضرات کو اس کا موقعہ دے کہ وہ اگر دیکھیں کہ ان بیانات میں کہیں کتمانِ حقیقت یا غلط بیانی سے کام لیا گیا ہے تو اس کی نشاندہی کریں اور اسے حکومت یا پارلیمانی کمیٹی کے نوٹس میں لائیں۔ اس سے مسئلہ صاف ہو جائے گا اور متعلقہ اتھارٹی کو صحیح نتیجہ پر پہنچنے میں دقت نہیں رہے گی۔ ہم سمجھتے ہیں کہ اس باب میں کچھ کہنے کی ضرورت نہیں کہ اس مسئلہ کے ہزار سیاسی پہلو ہوں، بنیادی طور پر اس کا تعلق دین کی اصل بنیاد اور قوم کے نازک ترین جذبات سے ہے۔ اس لئے اس کے حل کرنے کے لئے محض میکانکی طریق کار پر اکتفا نہیں کرنا چاہیئے۔ علاوہ ازیں اس حقیقت کو بھی پیشِ نظر رکھنا چاہیئے کہ اب تک لوگوں کے کفر اور اسلام کا فیصلہ علماء کرام اپنے کفر کے فتووں سے کیا کرتے تھے۔ یہ اختیار انہوں نے از خود ہی لے رکھا تھا۔ اسی لئے ان فتووں کی کوئی عملی حیثیت نہیں ہوتی تھی۔ (اس کا حق اور اختیار صرف اسلامی مملکت کو ہوتا ہے) اب یہ اختیار پارلیمان نے لے لیا ہے۔ یہ بہت بڑی ذمہ داری ہے جو انہیں سونپی گئی ہے۔ اس لئے انہیں اس باب میں بڑی احتیاط برتنے کی ضرورت ہے، بالخصوص اس لئے کہ ان کے فیصلہ نے (علماء کے فتووں کی طرح) محض نظری فیصلہ نہیں رہنا۔ اس نے آخر الامر قانونِ مملکت کی حیثیت اختیار کرنی ہے۔ ہمیں امید ہے کہ انہیں اپنی اس گرانبار ذمہ داری کا پورا پورا احساس ہوگا۔

دوسری طرف ہم افرادِ امت سے بھی درخواست کریں گے کہ وہ اپنے جذبات کو کسی حالت میں بھی بے قابو نہ ہونے دیں اور ہر قسم کی ہنگامہ آرائی اور فساد انگیزی سے مجتنب رہیں۔ امن اور سکون اس مسئلہ کے حل ہونے میں بڑا ممد و معاون ثابت ہوگا۔ واللہ المستعان۔ علیہ توکلت والیہ انیب۔

(۲۰ جولائی ۱۹۷۴ء)

شکریہ

جولائی ۱۹۷۴ء کے طلوعِ اسلام میں تبویب القرآن کے سلسلے میں جو اعلان شائع ہوا، بہت سے احباب نے مجھے اپنے مشوروں سے نوازا ہے۔ اور اس کا سلسلہ ہنوز جاری ہے میرے لئے مشکل ہے کہ میں فرداً فرداً ان کے خطوط کی رسید بھیجوں اور شکریہ ادا کروں۔ وہ انہی سطور کو میرا شکریہ تصور فرمائیں۔ ان کے مشورے میرے پیشِ نظر ہیں اور تبویب القرآن کی آخری ترتیب کے وقت ان سے استفادہ کیا جائے گا۔ احباب نے اس اعلان کا بڑی گرمجوشی سے استقبال کیا ہے اور دریافت کیا ہے تبویب کب تک شائع ہو جائے گا جیسا کہ اس اعلان میں عرض کیا گیا تھا اسکی اشاعت کا مرحلہ بڑا ہمت طلب ہے، اس لئے اس سلسلے میں کوئی حتمی وعدہ نہیں کیا جا سکتا۔ میں اتنا ہی کہہ سکتا ہوں کہ مجھے خود اس کی بڑی فکر ہے اور یہی کوشش کروں گا کہ اس میں غیر معمولی تاخیر نہ ہونے پائے۔ لیکن ادارے کا اپنا پریس نہ ہونے کی وجہ سے طباعت کے سلسلہ میں بعض اوقات ایسی مشکلات پیش آجاتی ہیں، جہاں ہم بالکل مجبور ہو کر رہ جاتے ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ تبویب حسنِ ترتیب کے ساتھ صحیح بھی چھپے اور حتی المقدور دیدہ زیب بھی۔

وبیدہ التوفیق۔

والسلام

پرویز

ختمِ نبوّت ــــ اور ــــ تحریکِ "احمدیّت"

(قرآن کریم کی روشنی میں ایک علمی تجزیہ)

طلوعِ اسلام کنونشن منعقدہ نومبر ۱۹۷۳ء میں جب پرویز صاحب نے اپنی تازہ ترین تصنیف "شاہکارِ رسالت" قرآنی حلقہ کی خدمت میں پیش کی تو احباب کی طرف سے تقاضا ہوا کہ اس کے بعد انہیں ختمِ نبوت اور "تحریک احمدیت" کے موضوع پر قلم اٹھانا چاہیئے جس کا ایک عرصہ سے انتظار ہے۔ اس پر پرویز صاحب نے کہا تھا کہ انہیں اس قرضہ کا بھی احساس ہے اور بتوفیقِ ایزدی امید ہے کہ وہ جلد از جلد اس سے بھی عہدہ برآ ہو جائیں گے۔ چنانچہ کنونشن کے بعد وہ اس طرف متوجہ ہو گئے اور اپریل ۱۹۷۴ء میں انہوں نے اس کتاب کا مسودہ مکمل کر لیا۔ ہمارا ارادہ تھا کہ اسے آہستہ آہستہ اطمینان اور سکون کے ساتھ نہایت حسن و خوبی سے طبع کرائیں گے اور آئندہ کنونشن پر پیش خدمت احباب کریں گے لیکن جون ۱۹۷۴ء میں اس مسئلہ نے جو ہنگامی شکل اختیار کی تو چاروں طرف سے تقاضے موصول ہونے شروع ہو گئے کہ موعودہ کتاب کو بلا تاخیر شائع کر دیا جائے۔ خود اس مسئلہ کی اہمیت بھی اس کی متقاضی تھی کیونکہ ہم دیکھ رہے تھے کہ جو کچھ اس سلسلہ میں عام طور پر کہا جاتا تھا وہ سطحی اور جذباتی تھا۔ اس کے برعکس پرویز صاحب نے اپنی روش و اسلوب کے مطابق اس موضوع پر کہ جو دین کی اصل و اساس ہے اور جس پر انہیں خصوصی عبور حاصل ہے۔ ہنگاموں سے متاثر ہوئے بغیر قرآن مجید کی روشنی میں خالصتاً علمی سطح پر گفتگو کی ہے چنانچہ ہم نے بعجلت مسودہ کی کتابت کرائی اور، اب وہ طباعت کے لئے تیار ہے۔ پرویز صاحب اس قدر سنجیدہ اور متوازن صاحبِ قلم ہیں کہ ان کی تحریر میں کوئی بات قابلِ اعتراض نہیں ہوتی۔ لیکن اس وقت حکومت کی طرف سے ملک بھر میں جو پابندیاں عائد ہیں، ان کے پیشِ نظر اس کتاب کی اشاعت میں بھی تاخیر ناگزیر ہے جونہی وہ پابندیاں اٹھ گئیں۔ کتاب شائع کر دی جائے گی اور اس کا اعلان طلوعِ اسلام میں کر دیا جائے گا۔ اس دوران میں احباب اپنی فرمائشوں سے ہمیں مطلع فرما دیں گے تو اُن کی تعمیل میں آسانی رہے گی۔ قیمت کا تعین کتاب کی طباعت کے بعد ہی کیا جا سکے گا۔

ناظم ادارہ طلوعِ اسلام

۲۵/بی گلبرگ ۲ لاہور

۱۴ اگست کی یاد میں

ذرا عمرِ رفتہ کو آواز دینا

(بائیس سال پہلے کی بات)

تشکیل پاکستان کے بعد، چند سالوں تک، ہمارا معمول یہ تھا کہ ہم ہر سال، ۱۴ اگست کے جشنِ آزادی کی تقریب پر قوم کے سامنے ایک آئینہ رکھا کرتے تھے تاکہ وہ اس میں دیکھ سکے کہ اس نے حصولِ پاکستان کی تحریک کے دوران، اور اس کے بعد، کن وعادی کا اعلان اور کن عزائم کا اظہار کیا تھا، اور اس وقت تک اس نے انہیں پورا کرنے کے لئے کیا کچھ کیا ہے۔ اس سلسلہ میں ابتدائی چار سالوں کے جشنوں کی تقاریب پر ہم نے جو محاسبہ خویش کیا تھا، اسے ہم اس سے پہلے طلوعِ اسلام کے صفحات میں پیش کر چکے ہیں۔ اشاعتِ حاضرہ میں ہم اس محاسبہ کو (بادنیٰ لفظی تغیر) پیشِ خدمت قارئین کرتے ہیں، جسے ہم نے ۱۹۵۲ء کے جشنِ آزادی کی تقریب پر حوالۂ قلم کیا تھا۔ مقصد اس سے یہ ہے کہ ہم دیکھیں کہ آج سے بائیس سال پہلے ہم کس مقام پر کھڑے تھے، ہماری مشکلات کیا تھیں اور ان کے حل کرنے کے لئے ہمارے پروگرام کیا۔ اور اس کے بعد دیکھیں کہ اس طویل عرصہ میں، ہم نے اس سلسلہ میں کیا کچھ کیا ہے۔ اور آج ہماری حالت کیا ہے؟ اگر ہماری حالت یہ ہے کہ ہم اس سطح سے بھی نیچے گر گئے ہیں جس پر ۱۹۵۲ء میں تھے، تو اس کے بعد سوچیے کہ اس رفتار سے ہمارا مستقبل کیا ہوگا؟

غالب نے چیخ کر کہا تھا کہ

زاں مے ترسم کہ باشد قعرِ دوزخ جائے من
وائے گر باشد ہمیں امروزِ من فردائے من

یعنی میں اس سے نہیں ڈرتا کہ فردائے قیامت مجھے جہنم میں جھونک دیا جائے گا۔ ڈرتا اس سے ہوں کہ کہیں میرا (آنے والا) کل ایسا ہی نہ ہو جیسا میرا آج (امروز) ہے۔ اور اس نکتہ غامض کے لئے اس نے کسبِ ضیا کیا تھا حضورؐ کی اس حدیث سے جس میں آپ نے فرمایا ہے کہ۔

جس کے دو دن ایک جیسے گذر جائیں (یعنی اس کا آج، اس کے گذشتہ کل سے بہتر نہ ہو) سمجھ لو کہ وہ تباہ ہو گیا۔

لیکن اس کے بعد آپ سوچیے کہ جس قوم کی حالت یہ ہو کہ:۔ آج اس کی منزلِ مقصود، کل سے دُور ہو، اس کا مستقبل کیسا ہوگا؟ اس تمہید کے بعد آپ دیکھئے کہ آج سے بائیس سال پہلے ہماری حالت کیا تھی۔

جشنِ آزادی

(شائع شدہ۔ طلوعِ اسلام، بابت اگست ۱۹۵۲ء)

دنیا کی پانچویں بڑی مملکت اور مسلمانوں کی سب سے بڑی سلطنت، پاکستان کو وجود میں آئے پانچ برس ہو چکے ہیں اس سالگرہ کی تقریب پر، غالب کی ہمنوائی میں، ہماری دعا ہے کہ

تم سلامت رہو ہزار برس ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

اگر اس پنج سالہ مدت کا جائزہ لیا جائے تو یہ حقیقت ابھر کر سامنے آجائے گی کہ اس وقت باشندگانِ پاکستان کو بالعموم تین طبقات میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ طبقۂ اوّل وہ ہے جس کی ترجمانی "فٹ پاتھ پر زندگی بسر کرنے والوں کا گروہ کرتا ہے۔ یہ اصطلاح بڑی جامع اور ہمہ گیر ہے اور اس کا اطلاق ہر اس "سانس لینے والی لاش" پر ہو سکتا ہے۔ جو زبانِ حال سے پکار پکار کر کہہ رہی ہے کہ

مجھ پہ گراں ہے آسماں اور ہوں گراں زمیں کو میں

یہی گروہ اکثریت میں ہے۔ اور اگر کسی مملکت یا قوم کی بلندی اور پستی ماپنے کا معیار اس کے عوام قرار پا سکتے ہیں تو ہمیں اپنے صحیح مقام کے متعلق کوئی غلط فہمی نہیں ہونی چاہیئے۔ عوام کو (MASSES) کہتے ہیں اور (MASS) کے معنی ہیں وہ بنیادی مسالہ جس سے کوئی ٹھوس وجود پذیر ہوتی ہے۔ اس لئے عوام درحقیقت وہ بنیادی اجزاء ہیں جن سے قوم ترکیب پاتی ہے۔ قوم افراد ہی کے مجموعے کا نام ہے۔ افراد کو الگ کر لینے سے قوم کا وجود باقی نہیں رہتا۔ لہٰذا جو حالت کسی قوم کے افراد کی اکثریت کی ہوگی وہی حالت اس قوم کی قرار پائے گی۔ ہمارے مطالبۂ پاکستان کی خشتِ اوّل یہی عوام تھے، اس لئے کہ ہمارا مطالبہ یہ تھا کہ ہندوستان کے جن علاقوں میں مسلمانوں کی اکثریت ہے ان میں ہماری اپنی حکومت ہونی چاہیئے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ "مسلمانوں کی اکثریت" کا انحصار تھا انہی عوام کی تعداد پر۔ بنا بریں، دعوئے پاکستان کی سیاسی اور آئینی بنیاد۔ اس کے حصول کی قوت اور اس کے وجود کا تعمیری مسالہ، یہی عوام ہیں جو خون کے دریا پیرتے اور آگ کے شعلوں سے کھیلتے، نگاہوں میں ایک نئی دنیا کا منظر اور دلوں میں ایک جہانِ نو کا تصور لیئے، اپنا سب کچھ برباد کر کے یہاں پہنچے تاکہ پاکستان آباد ہو جائے۔ انہوں نے یہاں پہنچ کر کچھ نہیں مانگا۔ کوئی مطالبہ نہیں کیا۔ شہروں میں آئے تو بڑے بڑے سرفلک محلات کے زیرِ سایۂ دیوار، رہ گذاروں (FOOT-PATHS) کے کنارے، بجری کے فرش اور اینٹ کے تکیے پر۔ اور اگر دیہات کی طرف رُخ کیا تو سڑکوں کے کنارے، درختوں کے سائے میں، یوں اطمینان سے سو گئے گویا ہفت اقلیم کی بادشاہت ان کے حصے میں آگئی۔ ان کے نزدیک پاکستان کی تشکیل فی الواقعہ ہفت اقلیم کی بادشاہت تھی، بلکہ اس سے بھی زیادہ۔ جب ان کی آنکھ کھلتی تو وہ دیکھتے کہ یہاں ساری دنیا لوٹ میں مصروف ہے۔ لیکن یہ ان کی طرف کبھی للچائی ہوئی نظروں سے نہ دیکھتے۔ ان کے تصورات کی رُو سے پاکستان نام تھا۔ دیانت، امانت اور عدل و انصاف کے سائے میں خوش حالیوں اور خوشگواریوں کی زندگی کی ضمانت کا۔ دن گذر گئے اور ان کی امیدوں کی ہر نورانی صبح، یاس انگیز شام کی تاریکیوں میں گم ہوتی چلی گئی۔ حتیٰ کہ ان "خداداد"[1] محلات کے مکینوں کی

---

[1] ہمارے ہاں "دولت خداداد" کے معنی لئے جاتے ہیں وہ دولت جو کسی کی محنت سے حاصل نہ ہوئی ہو بلکہ بیٹھے بٹھائے چھپر پھاڑ کر مل گئی ہو۔ اقبال کے الفاظ میں ــــ بہشتے "فی سبیل اللہ" ہم است۔

نگاہوں میں ان کا "فٹ پاتھ" پر سونا بھی کھٹکنے لگا۔ انہیں اندیشہ لاحق ہوگیا کہ اگر ان خاک نشینوں کو کسی دن، فٹ پاتھ کی پستی اور محلات کی بلندی کا تفاوت صحیح صحیح نظر آنے لگ گیا تو مبادا ان کے دل میں نیچے سے اٹھ کر اوپر جانے کا ولولہ بیدار ہو جائے۔ اس کے لئے انہوں نے ایسا انتظام کیا جس سے وقتاً فوقتاً "خطرے کی گھنٹی" بجادی جاتی ہے کہ ان لوگوں کو "فٹ پاتھ سے اٹھا دیا جائے گا۔ کیونکہ اس سے صحتِ عامہ" خطرے میں ہے۔ اس آواز کے سنتے ہی ان بچاروں کے اوسان خطا ہو جاتے ہیں۔ اور بے ساختہ پکارنے لگ جاتے ہیں کہ "ہمیں فٹ پاتھ سے نہ اٹھایئے۔

چنانچہ "حسنِ تدبیر" کی ان فسوں سازیوں سے ان عوام کو اس مقام تک پہنچا دیا گیا ہے جہاں ان کی زندگی کے تمام مقاصد مستقبل کے تمام تصورات، اپنی خوش حالیوں اور خوش گواریوں کے تمام ممکن مطالبات، سمٹ سمٹا کر، اس التجا میں مرکوز ہو گئے ہیں کہ "ہمیں فٹ پاتھ سے نہ اٹھایئے"۔ اب وہ اس سے زیادہ سوچنے کے قابل ہی نہیں رہے۔ غالبؔ نے جب یہ کہا تھا کہ

بیٹھے ہیں رہ گذر پہ ہم، کوئی ہمیں اٹھائے کیوں

تو اس میں ایک اندازِ استحقاق پایا جاتا تھا۔ لیکن اب "رہ گذر" پر بیٹھنے کے لئے بھی ہزار التجائیں کرنی پڑتی ہیں اور اس کے بعد بھی "سیاستِ درباں" کا ڈر اطمینان کا سانس نہیں لینے دیتا۔

یہ ہے وہ مقام جہاں ہمارے عوام کی اکثریت پہنچ چکی ہے۔ طبقۂ اعلیٰ ان کی طرف نہایت حقارت آمیز نگاہوں سے دیکھتا ہے اور بات بات پر ان کے عیوب گنانے شروع کر دیتا ہے۔ یہ جاہل ہیں۔ غلیظ ہیں۔ بدتمیز ہیں۔ "بے ایمان" ہیں۔ کام چور ہیں۔ سہل انگار ہیں ——— اور آگے بڑھیئے تو ——— جرائم پیشہ ہیں۔ بے غیرت ہیں۔ دیوث ہیں۔ پست اخلاق ہیں۔ کمینہ فطرت ہیں۔ اور نہ جانے کیا کیا ہیں۔ یہ سب سچ ہے لیکن ان "ناصحینِ مشفق" سے کون پوچھے کہ ان کے ان عیوب و اسقام کا ذمہ دار کون ہے؟ انہیں اس حالت تک پہنچا کس نے دیا ہے؟ ان سے کون کہے کہ

شکر بہ پرسشِ غم کا مگر اصرار نہ کر　　　پوچھنے والے یہ تیرا ہی کہیں راز نہ ہو!

یہ حضرات، یہ کچھ کہہ لینے کے بعد مطمئن ہو جاتے ہیں کہ قوم کی اصلاح ہو گئی اور یہ اپنے اہم فریضہ سے سبکدوش ہو گئے اور نہیں سمجھتے کہ حالات کس نازک مقام تک پہنچ رہے ہیں۔ فضائی علوم کے ماہرین (METEOROLOGISTS —) کا کہنا ہے کہ جب گرمی کی شدت سے کسی خاص خطۂ ارض کی ہوا گرم ہو کر اوپر اٹھ جاتی ہے تو وہاں خلا پیدا ہو جاتا ہے۔ اس خلا کو پُر کرنے کے لئے، دوسرے خطوں کی سرد ہوائیں ہجوم کر کے ادھر آتی ہیں اور گاہ تند و تیز جھکڑ کی شکل اختیار کر لیتی ہیں اور گاہ بادل بن کر برستی ہیں۔ یعنی کسی خاص مقام کی گرمی کی شدت، دعوت بن جاتی ہے۔ تباہ کار آندھیوں اور سیلاب آور بادلوں کے لئے۔ جو کچھ عالمِ آفاق میں ہوتا ہے وہی کچھ دنیائے انسانیت میں ہوتا ہے۔ ہمارے اس دور میں عوام کی وہ حالت جس کا اوپر ذکر کیا گیا ہے، از خود دعوت (INVITATION) بن جاتی ہے، کمیونزم کے اس سیلِ بے پناہ کے لئے۔

جس سیلِ سبک سیر و زمیں گیر کے آگے　　　عقل و نظر و علم و ہنر ہیں خس و خاشاک

اور جس کی طغیانیوں کو مقدس آرزوؤں کی کوئی دیوار اور جذباتی نعرہ آفرینیوں کا کوئی بند روک نہیں سکتا۔ آج اس سیلابِ بے پناہ کی موجوں کا شور بہروں کو سنائی دے رہا ہے اور اس کے بہاؤ کی تیز رفتاری اندھوں کو بھی نظر آ رہی ہے۔ لیکن اگر کسی کو نہ یہ دکھائی دیتی ہے نہ وہ سنائی، تو وہ ہمارے ارباب بست و کشاد ہیں جن کی کیفیت یہ ہے کہ لھم قلوب لا یفقھون بھا۔ ولھم اذان لا یسمعون بھا ولھم اعین لا یبصرون بھا اولٰئک کالانعام بل ھم اضل۔

ٹوٹا ٹوٹا، پتہ پتہ، حال ہمارا جانے ہے جانے نہ جانے گل ہی نہ جانے۔ باغ تو سارا جانے ہے

لیکن جہل یا تجاہلِ عارفانہ سے سیلاب رک تھوڑا جایا کرتے ہیں اس کے لئے تو کچھ کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔

دوسرا طبقہ وہ ہے جس کے نزدیک پاکستان سے مفہوم ہے، دولت سمیٹنا اور جاہ و مناصب کی کرسیاں سنبھالنا۔ ان میں سے کچھ کامیاب ہیں باقی ہنوز ناکام۔ جو کامیاب ہیں وہ اپنی "فتوحات" کی حفاظت کی فکر میں غلطاں و پیچاں ہیں۔ جو ناکام ہیں وہ اوّل الذکر سے ان "فتوحات" کے چھیننے اور جھپٹنے کی ہوس میں آشفتہ و پریشان۔ جو ان "فتوحات" کو سنبھالے بیٹھے ہیں۔ وہ اس متاعِ گراں بہا "دولت خداداد" کے تحفظ (یعنی انھیں اپنے تک محدود رکھنے) میں اسلام کی حفاظت، اور اس کی تقویت میں پاکستان کی تقویت قرار دیتے ہیں۔ جو لوگ ان فتوحات کو ان سے چھیننا چاہتے ہیں ان کا دعویٰ یہ ہے کہ اگر یہ چیز دوسری پارٹی کے پاس رہیں تو اس سے اسلام سخت خطرے میں اور پاکستان موت کی آغوش میں آجائے گا۔ برعکس اس کے اگر یہ مال و منال اور جاہ و اقتدار ان کے ہاتھ میں آجائے تو پھر اسلام محفوظ ہو جائے گا اور پاکستان مضبوط۔ ان میں سے جو کامیاب ہیں اُن کا دعویٰ یہ ہے کہ ہم قائدِ اعظم مرحوم کے ترکہ کے جائز وارث اور مسلم لیگ کی قبر کے متولی ہیں اس لئے اس آستانہ عالیہ کی سجادہ نشینی ہمارا حق اور "خلافت" ہمارا ورثہ ہے۔

قرآن بتاتا ہے کہ حکمتِ فرعونی کی رُو سے قوت کے استحکام کا راز اس میں ہوتا ہے کہ مملکت کے باشندوں کو پارٹیوں میں تقسیم کر دیا جائے (وجعل اھلھا شیعا) تشکیلِ پاکستان کے بعد سب سے پہلی آواز جو طلوعِ اسلام کی طرف سے بلند کی گئی تھی، یہ تھی کہ اب پوری کی پوری ملتِ اسلامیہ پاکستانیہ کو ایک جماعت تصور کیا جائے اور ملت کے اندر پارٹی بازی کی قطعاً اجازت نہ دی جائے کیونکہ قرآن کی رُو سے اس قسم کی پارٹی بازی اور گروہ سازی شرک ہے۔ اس مقصدِ عظیم کے حصول کے لئے پہلا اور مؤثر قدم یہ بتایا گیا تھا کہ مسلم لیگ کو ختم کر دیا جائے لیکن اربابِ متعلقہ نے ایسا نہ کیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ملک میں مختلف پارٹیاں وجود میں آگئیں اور اس طرح ملت ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی۔ اب ہر پارٹی (مسلم لیگ سمیت) دوسروں کو فتنہ پرداز، تخریبی عنصر، پاکستان کے دشمن، تفرقہ انگیز قرار دیتی ہے اور اپنے آپ کو ملک و ملت کی بہترین بہی خواہ اور جاں نثار کل حزب بما لدیھم فرحون

دوسری آواز جو طلوعِ اسلام کی طرف سے اٹھائی گئی تھی یہ تھی کہ پاکستان کے مختلف صوبوں کو مٹا کر ایک مرکزی حکومت قائم کر دی جائے تاکہ صوبجاتی تفریق کی لعنت ختم ہو۔ لیکن چونکہ یہ قدم بھی ملت کی وحدت کی طرف منجر تھا۔ (فلہٰذا اقتدار پرست طبقہ کے مفاد کے خلاف جاتا تھا کیونکہ ان کی قوت کا راز ملت کی تفریق و تقسیم میں ہے) اس لئے اس کی بھی مخالفت کی گئی۔ اس مخالفت کی ایک وجہ اور بھی تھی۔ برسرِ اقتدار پارٹی کے پاس لوگوں کو اپنے ساتھ رکھنے کے لئے مناصب و مدارج ہی کی تو جاذبیت ہے۔ جسقدر زیادہ اسمبلیاں، وزارتیں، عہدے، مناصب ہوں گے اسی قدر زیادہ تعداد برسرِ اقتدار پارٹی کیساتھ رہے گی نتیجہ اس کا یہ کہ صوبجاتی تفریق، باہمی نفرت بلکہ عداوت کی حد تک پھیل چکی ہے اور آج پاکستان میں کوئی "پاکستانی" نہیں بستا۔ مختلف صوبوں کے افراد بستے ہیں جن میں باہمی مودت اور ائتلاف تو کجا ہم وطنی تک کے روابط و تعلقات بھی باقی نہیں رہے۔ اس صوبجاتی گروہ بندی کو اسقدر تشدید کر دیا گیا ہے کہ ملازمتوں میں بھی صوبجاتی نیابت (PROVINCIAL QUOTAS) مقرر کر دی گئی ہے۔ ہندوستان میں مسلمانوں کے لئے ملازمتوں میں جداگانہ نیابت کا اصول اس بنیاد پر منوایا گیا تھا کہ ہندو اور مسلمان دو الگ الگ قومیں ہیں جن کے مفاد ایک دوسرے سے متضاد و متناقض ہیں۔ لہٰذا ملازمتوں میں ان کے نیابتی حقوق بھی الگ الگ

ہونے چاہئیں۔ تشکیل پاکستان کے بعد ہندوؤں اور مسلمانوں کی جداگانہ قومیت کا سوال تو ختم ہو گیا لیکن یہاں مختلف صوبوں میں جداگانہ نیابت کے اصول کو برقرار رکھ کر ملت کو اسی طرح مختلف "قوموں" میں بانٹ دیا جس طرح ہندوستان میں ہندو اور مسلمان مختلف قوموں میں بٹے ہوئے تھے۔ پاکستان کے مطالبہ کی بنیاد (بلکہ اصل پوچھیئے تو ہمارے دعوائے اسلام کی صداقت) اس اصول پر تھی کہ مسلمانوں کی قومیت کا مدار، جغرافیائی حدود پر نہیں بلکہ دین کی وحدت پر ہے۔ اس دعوے کی بنا پر ہم نے پاکستان کا مقدمہ جیتا اور اسی بنیاد پر ہم مسلمان کہلاتے ہیں لیکن تشکیل پاکستان کے بعد، یہ تمام اصول و معانی، نقش و نگارِ طاقِ مفاد پرستی ہو گئے اور مختلف صوبوں کے مسلمان عملاً مختلف قومیتوں میں بٹ گئے۔ چنانچہ آج یہ امر واقعہ ہے (خواہ اس کا تذکرہ کسی قدر دلخراش اور جگر سوز ہی کیوں نہ ہو) کہ ملازمتوں میں جداگانہ نیابت کی بنا پر ہندوستان میں ہندوؤں اور مسلمانوں میں جس قدر بغض اور عناد تھا پاکستان کے مختلف صوبوں کے مسلمانوں میں اس سے کم بغض و عناد نہیں۔ حیرت ہے کہ ہم نے ہندوستان میں مختلف صوبوں کے مسلمانوں کے لئے جداگانہ ملازمتی نیابت کا سوال کبھی نہیں اٹھایا تھا۔ لیکن آج یہ سوال ہماری سیاست کی خشتِ اوّل بن چکا ہے۔

ان سب گروہ بندیوں اور پارٹی بازیوں، صوبجاتی نیابتوں اور متفرق اسمبلیوں اور وزارتوں کا نتیجہ یہ ہے کہ اس وقت ملک میں صرف افراد بستے ہیں، قوم کا کہیں نام و نشان نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جس قدر مسائل حیات، قومی (یعنی اجتماعی) سطح (LEVEL) پر حل ہوا کرتے ہیں۔ پاکستان میں ان کی طرف کسی کی نگاہ ہی نہیں اٹھتی۔ یہ کیفیتِ حال مفاد پرست گروہ کے لئے تو سازگار ہوتی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ اس سے مملکت کی بنیادیں کھوکھلی ہو جاتی ہیں؛

یہ تو رہی کامیاب گروہ کی حالت ناکام (یعنی مناصب و اقتدار کی کرسیاں چھیننے کی ہوس میں رقصاں و جنباں) پارٹیوں میں سے ایک جماعت ایسی ہے جو باقی پارٹیوں کے مقابلہ میں سب سے زیادہ خطرناک ہے ـــ پاکستان اور انسانیت دونوں کے لئے خطرناک ـــ یوں تو

تاریخِ امم کا یہ پیامِ ازلی ہے صاحبِ نظراں! نشۂ قوت ہے خطرناک

لیکن تاریخ ہی ہمیں یہ بھی بتاتی ہے کہ جب زمامِ اختیار ان لوگوں کے ہاتھ میں آ جائے جو خدا کے نام (مذہب) کو اپنی ہوسِ اقتدار کا آلۂ کار بنائیں، تو یہ ادوار تاریخ انسانیت میں سب سے زیادہ وحشت انگیز اور انسانیت کش ہوتے ہیں۔ اس وقت ہر گرگِ خون آشام، برۂ معصوم کی کھال اوڑھ کر سامنے آ تا ہے اور ہر ابلیس، خدائی فوجدار ہونے کا مدعی ہوتا ہے۔ جبر و قہرمانیت کے اس اندازِ سیاست میں، جیسے مذہبی پیشواؤں (PRIESTS) کا گروہ "حکومتِ الٰہیہ" (THEOCRACY) کے مقدس نام سے لوگوں پر مسلط کرتا ہے، خدا کے نام پر، ہر وہ ظلم و استبداد روا رکھا جاتا ہے جس سے خود ظلم شرما جائے اور استبداد کی آنکھوں میں حیا آ جائے۔ اہلِ پاکستان کی بدبختی سے، آج ان "فتوحات" چھیننے والے ہوس کاروں میں ایک گروہ وہ ہے جو اپنے حصولِ مقصد کے لئے مذہب کو آلۂ کار بنا رہا ہے۔ یہی ہے وہ سب سے زیادہ خطرناک گروہ جس کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ہے ان لوگوں کی داستان بڑی دلچسپ (اور معیار انسانیت کے مطابق بڑی افسوسناک) ہے ملک کی دوسری پارٹیاں جو حصولِ اقتدار کے لئے باہم دست و گریباں ہیں، ان کی پھر بھی یہ کیفیت ہے کہ وہ حصولِ پاکستان کی تحریک کے ہم نوا تھے اور اس مقصد کے لئے اس زمانے میں جو کوششیں بھی ہو رہی تھیں، ان میں مسلم لیگ کا ساتھ دیتے تھے۔ لیکن مذہب کے نام پر زمامِ اقتدار حاصل کرنے والے مقدسین کے اس طائفہ کا ماضی یہ ہے کہ تحریکِ پاکستان کے زمانے میں یہ جماعت پاکستان کی بدترین دشمن تھی

اور چونکہ اُن کا اُس وقت بھی یہ دعویٰ تھا (جیسا کہ آج دعویٰ ہے) کہ کسی مسلک سے ان کی موافقت یا مخالفت ذاتی رجحانات کی بنا پر نہیں بلکہ از رُوئے شریعت ہوتی ہے اس لئے یہ حضرات اس وقت تحریکِ پاکستان کو شریعت کے خلاف قرار دیتے تھے اور مسلمانوں کو اِس "زہر ملے حلوے" سے دور رکھنے کی ہر ممکن کوشش کرتے تھے۔ لیکن پاکستان بن جانے کے بعد ان حضرات کی "شریعتِ حقہ" نے یہ فتویٰ دے دیا کہ اس مملکت کی حکومت کی کرسیوں پر متمکن ہونے کی کوشش عین جہاد ہے جس کا مقام تو خیر بہت بلند ہے۔ آپ غور کیجئے کہ کیا دنیا میں کوئی انسان جس کے دل میں اصول پرستی کا ذرا سا بھی خیال ہو، اس قسم کی ننگِ انسانیت روش اختیار کر سکتا ہے ؟

اَب ہمارے سامنے تیسرا گروہ آتا ہے اور یہی گروہ درحقیقت ہمارا مخاطب ہے اور انہی سے ہماری توقعات وابستہ ہیں یہ وہ گروہ ہے جس نے تحریکِ پاکستان میں پورے انہماک سے حصہ لیا۔ اس گروہ کے سامنے پاکستان کے حصول سے کوئی ذاتی مفاد نہیں تھا۔ ان کا مقصد صرف اس قدر تھا کہ اس خطۂ زمین میں خدا کے اُس نظامِ عدل و ربوبیت کو عملاً نافذ کیا جا سکے جو انسانیت کی نشوونما کا ضامن اور جوہرِ خودی کی برومندی اور ثمر باری کا کفیل ہے۔ یہ گروہ، ان حسین توقعات کو لے کر پاکستان آیا تھا لیکن اس پانچ سال کے عرصے میں جو کچھ انھوں نے دیکھا اس سے یہ سخت شکستہ خاطر ہو گئے اور اَب ان کی حالت یہ ہو چکی ہے کہ یہ مستقبل سے نا امید ہو کر عملی رہبانیت اختیار کر چکے ہیں۔ یہ وہ گروہ تھا جو طلوعِ اسلام کی قرآنی آواز پر شریکِ ہنگامۂ تحریکِ پاکستان ہوا تھا اور اس لئے یہ (ایک مخلص اور شفیق لیکن غم خوردہ دوست کی طرح) طلوعِ اسلام سے اس طرح گلہ سنج ہے گویا یہی ان حالات کا ذمہ دار ہے جو پاکستان میں رونما ہوئے (اور ہو رہے ہیں) طلوعِ اسلام ان کی شکایت ہائے رنگین کو سر آنکھوں پر رکھتا ہے اور اس قلبی تعلق کی بنا پر جو انھیں طلوعِ اسلام سے ہے (اور جس کا اظہار ان محبت آمیز شکووں کی صورت میں ہوتا ہے) اُن سے خصوصی تخاطب چاہتا ہے۔ آؤ آج ایک مدت کے بعد ذرا جی کھول کر باتیں کریں۔

غزل سرائے و نوا ہائے رفتہ باز آور — باین فسردہ دلاں حرفِ دل نواز آور

یہ ایک حقیقت ہے جس سے (ہم میں سے) کسی کو بھی انکار نہیں ہو سکتا کہ (i) ایک خطۂ زمین کا حاصل کرنا اور (ii) اس خطۂ زمین میں خالص قرآنی نظام کا رائج کرنا، دو متمیز شقیں تھیں۔ یہ ظاہر ہے کہ شقِ اوّل کے حصول کے بغیر شقِ دوم کا سوال ہی پیدا نہیں ہو سکتا تھا۔ ہمارا اور آپ کا منتہائے نگاہ شقِ دوم تھی لیکن اس کے لئے پہلا مرحلہ شقِ اوّل کا حصول تھا۔ ہندوستان میں سیاسی تبدیلیاں اس سُرعت سے رُونما ہو رہی تھیں کہ اگر ہم اپنی توجہ شقِ اوّل سے ذرا بھی اِدھر اُدھر ہٹا لیتے تو زمانہ ہمیں روند کر آگے بڑھ جاتا اور اس شق کا حصول ناممکن ہو جاتا۔

جیسا کہ ہم پہلے لکھ چکے ہیں، اس وقت تحریکِ پاکستان کے مخالف مسلمان دو گروہوں میں بٹے ہوئے تھے۔ ایک گروہ نیشنلسٹ مسلمانوں کا تھا جو مسلمانوں کی جداگانہ قومیت اور جداگانہ حکومت کے تصور کا مخالف تھا۔ دوسرا گروہ اسلامی جماعت والوں کا تھا جو مسلمانوں کو تحریکِ پاکستان کے خلاف) یہ کہہ کر ورغلاتے تھے کہ اصل چیز کسی خطۂ زمین کا حصول نہیں بلکہ پیدائشی مسلمانوں کو اصلی مسلمان بنانا ہے۔ اِس "مقدس جہاد" سے ان کا مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں کی توجہ حصولِ پاکستان سے ہٹا کر دوسری طرف منعطف کر دی جائے اور اتنے میں ہندوستان پورے کا پورا ہندوؤں کے ہاتھ میں چلا جائے۔ یہ سب کچھ اس جذبے کے ماتحت ہو رہا تھا کہ مسلمانوں نے اپنی قیادت کے لئے مرکزی حیثیت محمد علی جناح کو کیوں دے دی ہے، ہمیں قائدِ اعظم کیوں نہیں بنایا گیا۔ ان دونوں گروہوں کے برعکس

طلوعِ اسلام کی آواز یہ تھی کہ سیاسی حالات نے ایسے تقاضے پیدا کر دیئے ہیں جن کے پیشِ نظر سب سے مقدم سوال یہ ہے کہ پورے کے پورے ہندوستان کو ایک مملکت تسلیم کر لیا جائے یا مسلمانوں کو اپنی جداگانہ مملکت کے قیام کے لئے ایک خطہ ملک الگ دے دیا جائے۔ طلوعِ اسلام کا کہنا یہ تھا کہ اگر ہم اسوقت اپنی علیحدگی کے مطالبہ میں ذرا بھی چوک گئے تو پھر شقِ دوم (یعنی ایک خطۂ زمین میں قرآنی نظام کی ترویج و تنفیذ) ناممکن ہو جائے گی۔ آپ حضرات نے طلوعِ اسلام کی اس آواز کی تائید کی اور ہندوستان کے بٹوارے میں ایک خطۂ زمین مسلمانوں کی تحویل میں آگیا۔

ہم پوچھتے یہ ہیں کہ کیا یہ کامیابی (مفاد پرستانہ نقطۂ نظر سے نہیں بلکہ اس مقصدِ عظیم یعنی شقِ دوم کے پیشِ نظر جس کا اوپر ذکر کیا جا چکا ہے) کچھ کم کامیابی تھی؟ کیا یہ تبدیلی ایسی تھی جس پر ہم آج اس طرح شکوہ سنج اور گلہ طراز ہو جائیں؟ کیا آپکی سعی و عمل کا یہ نتیجہ ایسا تھا جس پر آپ متاسف و پشیمان ہوں؟ اگر یہ تاسف و پشیمانی کا نتیجہ نہیں بلکہ ترکِ تہنیت ہے تو پھر اس سے دل گرفتگی اور شکستہ خاطری کیوں؟ یہ تو بہت بڑی کامیابی ہے جو تمہیں نصیب ہوئی تھی۔ فلیفرحوا بھا۔

اب لیجئے شقِ دوم۔ یعنی پاکستان میں قرآنی نظام کی ترویج و تنفیذ کو۔ اس باب میں آپ کی بنیادی غلطی یہ تھی کہ آپ نے سمجھ لیا تھا کہ شقِ اوّل (زمین کے حصول) کے بعد شقِ دوم خود بخود پیچھے پیچھے چلی آئے گی۔ جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے، یہ دونوں شقیں الگ الگ تھیں اور ان میں باہمی ربط صرف اسقدر تھا کہ شقِ دوم کے حصول کے لئے شقِ اوّل کا حصول ناگزیر تھا، جس طرح مکان بنانے کے لئے زمین کا حاصل کرنا ناگزیر ہوتا ہے۔ شقِ اوّل کے حصول کے بعد شقِ دوم کے لئے ایک نئے سلسلۂ جدوجہد اور سعی و کاوش کی ضرورت تھی۔ اس جدوجہد کی ذمہ داری آپ کے سر تھی کیونکہ شقِ دوم کا تصور صرف آپ کی نگاہوں کے سامنے تھا۔ سوچیئے کہ آپ نے اس جدوجہد میں کس قدر حصہ لیا ہے؟

آپ اس لئے مایوس ہو گئے کہ آپ کے نزدیک ہمارے "طبقۂ اعلیٰ" کا کیرکٹر اسقدر پست نکلا؛ لیکن یہ بھی کوئی خلافِ توقع بات نہ تھی جس سے اس قدر مایوسی ہو جاتی۔ پہلی قابلِ غور بات تو یہ ہے کہ آپ نے انھیں "طبقۂ اعلیٰ" فرض کس طرح کر لیا؟ محض اس بنا پر کہ ان میں سے اکثر لوگ ایک اتفاقی حادثہ (نہ کہ جوہرِ ذاتی) کی بنا پر جاہ و مناصب کے مالک بن گئے؟ اگر اس طرح جاہ و منصب کے حصول سے کوئی انسان بلند مرتبہ قرار پا سکتا تو اسلام ملوکیت کو کبھی وجہِ فسادِ آدمیت قرار نہ دیتا۔ ملوکیت میں یہی ہوتا ہے کہ ایک شخص ایک اتفاقی حادثہ (بادشاہ کے گھر پیدا ہو جانے) کی بنا پر برسرِ اقتدار آجاتا ہے، اس اقتدار کو اپنے ذاتی جوہروں اور بلند صلاحیتوں کی بنا پر حاصل نہیں کرتا۔ اس لئے قرآن اس طرح اقتدار کا وارث بن جانیوالے کو اکرم (واجب التکریم) قرار نہیں دیتا۔ اس کے نزدیک اکرم (واجب التکریم) وہی ہے جو ذاتی جوہروں کی بنا پر اس مقام کا مستحق قرار پاتا ہے (ان اکرمکم عند اللہ اتقکم) لہٰذا قرآنی معیار کے مطابق یہ طبقہ، طبقۂ اعلیٰ قرار ہی نہیں پا سکتا

دوسرے یہ کہ اسوقت ہمارے معاشرے میں جسقدر خرابیاں ابھری ہوئی نظر آرہی ہیں، یہ سب پہلے بھی موجود تھیں۔ فرق صرف یہ تھا کہ ہندوستان میں ان کے ابھرنے کے مواقع کم تھے یہاں وہ مواقع بکثرت سامنے آگئے اسلئے یہ مستور خرابیاں ابھر کر سطح کے اوپر آگئیں۔ چیچک کا مواد تو بہت پہلے سے جسم میں موجود ہوتا ہے جسوقت خارجی حالات اس سے موافق ہو جاتے ہیں وہ ابھر کر چیچک کے دانوں سے سارے جسم کو داغدار بنا دیتا ہے یا یوں کہیئے کہ پاکستان بننے کے بعد کیرکٹر کی پستی کے مظاہرات کی نوعیت میں فرق آگیا ہے۔ محکومی کے زمانے کے عیوب اور قسم کے ہوتے ہیں اور قوت و اقتدار کے ذمائم اور قسم کے ہندوستان میں ہمارے معاشرے کے عیوب و نقائص اوّل الذکر قسم سے تھے۔ حصولِ اقتدار کے بعد یہ دوسری قسم میں بدل گئے۔ آپنے یہ بات

اکثر سنی ہوگی کہ معلوم نہیں کیا وجہ ہے، جس شخص کے ہاتھ میں اختیار آجاتے وہ انہی جیسا ہو جاتا ہے جن کی شکایتیں پہلے وہ خود کیا کرتا تھا۔ ایسا اسلئے کہ پہلے اس کی نیتی سیرت کے مظاہرے کے مواقع نہیں تھے اسلئے وہ مستور تھی۔ اختیار ملنے پر وہ مشہود ہوگئی۔ یا یہ کہ پہلے اس کے عیوب اور قسم کے تھے۔ صاحب اقتدار ہونے پر ان کی نوعیت بدل گئی۔

لہٰذا یہ عیوب ہمارے پورے معاشرے میں پھیلے ہوتے ہیں اور ایک مدت سے چلے آرہے ہیں۔ ان میں نہ ادنیٰ کی تخصیص ہے نہ اعلیٰ کی۔ نہ ہی پاکستان تک محدود ہیں۔ مسلمانوں کے تمام ممالک کا یہی حال ہے اس لئے یہ چیز بھی وجۂ مایوسی نہیں ہونی چاہیئے۔

اب سوال یہ ہے کہ اس صورتحالات میں کیا کیا جائے؟ اسکے دو ہی جواب ہو سکتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ (خدا نکردہ) بھارت ورش کے ہندوؤں سے یہ کہہ دیا جائے کہ ہم سے حماقت ہوئی جو تم سے الگ ہوگئے۔ ہماری توبہ ہماری ہفت پشت ہفتاد نسل کی توبہ۔ اس خطۂ زمین کو پھر سے ہندوستان میں شامل کر لیجئے اور ہمیں اپنی غلامی میں قبول فرما لیجئے۔ یہ وہ انداز (ATTITUDE) تھا جسے بنی اسرائیل نے اختیار کیا تھا۔ جب صاحب ضرب کلیم انھیں فرعون کی غلامی سے نکال کر سینا کی وادیوں میں لے آئے تھے تاکہ وہاں انسانوں کی ذلت آمیز غلامی سے نکال کر اپنے خدا کے حیات بخش قانون کے مطابق زندگی بسر کر سکیں وہ قدم قدم پر حضرت موسیٰؑ کا دامن پکڑ کر بیٹھ جاتے اور نہایت تند و تلخ لہجہ میں کہتے کہ تم نے ہم پر ظلم کیا جو یہاں لے آئے۔ ہم وہیں اچھے تھے۔ اب بھی ہمیں وہیں بھیج دو۔ کس اطمینان اور سکون کی تھی وہ زندگی!

نے تیر کماں میں تھا نہ صیاد کمیں میں — گوشے میں قفس کے ہمیں آرام بہت تھا

ہم پوچھتے ہیں اپنے اس مخاطب گروہ سے کہ کیا آپ واقعی یہ چاہتے ہیں کہ آپ کی آرزوؤں کی آماجگاہ، یعنی سرزمین پاکستان پھر سے ہندو کو لوٹا دی جائے۔ اور آپ اور آپکی آنیوالی نسلیں ان کی غلامی میں زندگی بسر کریں؟ ہم نہیں سمجھتے کہ اس گروہ میں سے ایک شخص بھی ایسا ہوگا جو یہ کہے کہ ہاں میں یہی چاہتا ہوں؟ یہ کچھ تو وہ پاگل کہے گا جس کے نزدیک سر درد کا علاج سر کاٹ دینا ہو؛ جو یہ سمجھتا ہو کہ اگر کسی بچے نے سلیٹ پر غلط الفاظ لکھ دیئے ہوں تو بجائے اس کے کہ انھیں مٹا کر ان کی جگہ صحیح الفاظ لکھ دیئے جائیں، اس سلیٹ ہی کو توڑ دینا چاہیئے۔ ہمیں اس کی قطعاً توقع نہیں کہ ہمارے زیر نظر گروہ میں کوئی بھی ایسا پاگل ہوگا جو اس قسم کا خیال تک بھی دل میں لائے خواہ حالات کی ظلمت انگیزیوں نے اسے کتنا ہی مایوس کیوں نہ کر دیا ہو!

دوسری صورت لامحالہ یہی ہے کہ اب جبکہ یہ خطۂ زمین حاصل ہو چکا ہے، اس میں قوانینِ خداوندی کے نفاذ کی کوشش کی جائے ہم اپنے اس مخاطب گروہ سے پوچھتے ہیں کہ آپ (اور صرف آپ) ہی وہ تھے جو ایک خطۂ زمین اس لئے چاہتے تھے کہ اس میں نظامِ خداوندی کو رائج کیا جا سکے۔ اب اگر آپ ہی ہمت ہار بیٹھیں تو بتایئے کہ اس نظام کی تنفیذ و ترویج کا کوئی امکان باقی رہے گا؟ آپ کے علاوہ کوئی گروہ ایسا نہیں جو اس نظام کی ترویج سے خوش ہو، اسلئے کہ اس نظامِ عدل و ربوبیت میں ہر مفاد پرست گروہ کو اپنی موت نظر آتی ہے۔ یہ وہ نظام ہے جسمیں کوئی انسان کسی دوسرے انسان کا محکوم نہیں ہوتا اسلئے اس نظام میں حکومت و اقتدار کی ہوس رکھنے والوں کی موت ہے۔ یہ وہ نظام ہے جسمیں خدا اور بندے کا براہِ راست تعلق (بذریعہ قانونِ خداوندی) قائم ہو جاتا ہے اسلئے اسمیں ملا کی پیشوائیت (PRIESTHOOD) کی موت ہے۔ یہ وہ نظام ہے جسمیں رزق کے سرچشمے اللہ کے قانون کے مطابق رزق بانٹنے والوں کے ہاتھ میں ہوتے ہیں، اس لئے اس میں، زمینداروں، جاگیرداروں، زرداروں اور سرمایہ پرستوں کی موت ہوتی ہے۔ یہ وہ نظام ہے جسمیں ہر فرد مملکت کی بنیادی ضروریاتِ زندگی (روٹی، کپڑا، مکان، حفاظت

کی بہم رسانی اور ان کی مضمر انسانی صلاحیتوں کے نشوونما ارتقاء کے اسباب و ذرائع کی فراہمی نظامِ معاشرہ کے فرائض ہوتی ہے اسلئے اسمیں ہر اس مفاد پرست کی موت ہے جو دوسروں کی احتیاج سے فائدہ اٹھا کر ان کے خون کی رنگینی سے اپنے عشرت کدہ کی تزئین و آرائش کا سامان خریدتا ہے۔ سوچیئے کہ ان گروہوں میں سے کوئی گروہ بھی ایسا ہو سکتا ہے جو اس نظام کے قیام و استحکام کے لئے کوشاں ہو؟ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ یہ اتنے ہی پاگل ہیں کہ اپنے ہاتھوں اپنی خودکشی کا سامان بہم پہنچا لیں!

اندریں حالات آپ فرمایئے کہ اگر آپ بھی نامساعدتِ حالات سے مایوس ہو کر رسمِ خانقاہیت اختیار کر لیں اور دنیا کے ہنگاموں سے منہ موڑ کر گوشوں اور زاویوں میں روٹھ کر بیٹھ جائیں، تو اس نظامِ ربوبیت کی تنفیذ کیلئے آسمان سے فرشتے آئیں گے؟ اگر وہ سر جن میں ربوبیتِ انسانیہ کو بے حجاب جلوہ فرما دینے کا سودا تھا۔ اسطرح بار بدوش ہو جائیں تو کہیئے کہ باطل کے انسانیت سوز کارگہِ شیشہ گراں میں "طوفان اندازی کا جنون" اپنا مسکن کہاں تلاش کرے؟ اگر وہ دل جن میں ارضی، معاشرہ کو سماوی قوانین سے ہم آہنگ کرنے کا ولولہ موج انگیز تھا، فرطِ یاس سے لحدِ سینہ سے ہم آغوشِ موت ہو جائے تو فرمایئے کہ مفاد پرست مہرہ بازیوں کی بساط الٹنے کا جذبہ کون سے قلب کو اپنا مامن بنائے؟ سوچیئے اور جواب دیجئے۔ اس کا جواب آپ کے ذمے ہے کہ اگر اس مقام تک پہنچ کر یوں روٹھ کر بیٹھ جانا تھا۔

مکتبِ عشق میں کیا کام تھا، آیا تھا کیوں؟

اس وقت حالت یہ ہے کہ استبداد کے پنجۂ آہنی میں جکڑی ہوئی انسانیت، متیٰ نصر اللّٰہ۔ متیٰ نصر اللّٰہ پکار رہی ہے اور تم، کہ جن کی زبانوں پر، ان حالات میں بے ساختہ نحن انصار اللّٰہ کا نعرۂ جاں بخش آ جانا چاہیئے تھا، نامساعدتِ حالات سے منہ موڑ کر بت بنے بیٹھے ہو؟

وائے سنگے کہ صنم گشت و بہ مینا نرسید!

تم مایوس اس لئے ہو گئے ہو کہ تم نے فرض کر لیا ہے کہ حالات اس حد تک بگڑ چکے ہیں کہ ان میں تبدیلی پیدا کرنا ناممکن ہے حالانکہ ذالکم الشیطٰن یخوف اولیاءہٗ۔ یہ ابلیس کا دھوکا ہے جو تمہیں اس طرح موہوم چھلاؤں سے ڈراتا ہے آپکو معلوم ہے کہ لفظ ابلیس کا مادہ ابلاس ہے اور ابلاس کے معنی ہی ناامیدی ہیں اسلئے ابلیس کا حربہ یہ ہے کہ وہ انسان کے دل میں ناامیدی پیدا کر دے۔ اس وقت آپ مایوس ہیں جس کے معنی یہ ہیں کہ آپ پر ابلیس کا جادو چل گیا ہے اور ابلیس کا جادو سوائے فریبِ نگاہ کے اور کچھ نہیں ہوتا۔ جن حالات کو آپ اس درجہ حوصلہ فرسا اور ہمت شکن خیال کرتے ہیں وہ صرف اس وقت تک ہمت شکن ہیں جب تک آپ مایوسیوں کے ابلیسانہ فریب میں گھرے ہوتے ہیں۔ اگر آپ ایک دفعہ زندہ امیدوں کا سہارا لے کر اٹھ کھڑے ہوں تو آپ دیکھیں گے کہ ان نگاہ فریب چھلاؤں کا کہیں وجود تک بھی نظر نہیں آئے گا حقیقت یہ ہے کہ

ایں صنم تا سجدہ اش کردی خداست! چو یکے اندر قیام آئی فناست

یہ برف کے بت "سورج کی پہلی کرن کے ساتھ ہی پگھلنے شروع ہو جاتے ہیں۔ محرومِ دیانت معاشری نظام (CORRUPT SOCIAL ORDER) خود اپنے بوجھ سے ٹوٹ جایا کرتا ہے۔ تدبیر کی فسوں سازیاں اسے زیادہ دیر تک قائم نہیں رکھ سکتیں۔ تاریخ کے اوراق اس پر شاہد ہیں۔ باقی رہی مذہبی پیشوائیت کی غوغا آرائی۔ تو (جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے) اس کا وجود زمینداری کی تائید پر قائم ہے۔ لیکن جب زمانے کے تقاضے، خود زمینداری ہی کو ختم کرنے کے درپے ہیں تو اس شاہ بلوط

کے آسرے پر ایستادہ انگور کی بیلیں کب تک قائم رہ سکیں گی؟ اس میں شبہ نہیں کہ ان "مقدس پیشوایانِ ملت" کی کوشش یہ ہے کہ ان کا یہ آسرا زیادہ سے زیادہ عرصہ تک قائم رہ سکے، لیکن ان کی یہ چارہ سازی اسی قسم کی ہے جس قسم کی تدبیریں، پیرانِ کلیسا، جمعیت الاقوام کو زندہ رکھنے کے لئے کیا کرتے تھے اور جن کے متعلق اقبالؒ نے کہا تھا کہ۔

بیچاری کئی روز سے دم توڑ رہی ہے ڈر ہے خبرِ بد نہ مرے منہ سے نکل جائے
تقدیر تو مبرم نظر آتی ہے ولیکن پیرانِ کلیسا کی دعا یہ ہے کہ ٹل جائے
ممکن ہے کہ یہ داشتۂ پیرکِ افرنگ ابلیس کے تعویذ سے کچھ روز سنبھل جائے

حقیقت یہ ہے کہ اس وقت ساری دنیا میں پیشوائیت (PRIESTHOOD) کے پاؤں اکھڑ چکے ہیں۔ اب اس کا آخری حربہ یہ ہے کہ یہ "ماڈرن ازم" کے نقاب میں سامنے آ رہی ہے (جیسا کہ پاکستان میں بدیہی طور پر ہو رہا ہے) لیکن یہ بھی اس کی حرکتِ مذبوحی ہے۔ یہ فریب زیادہ دن چل نہیں سکتا۔ اب دنیا قرآن کے بہت قریب آ چکی ہے۔ اب ملوکیت، پیشوائیت، سرمایہ پرستی، نسلی امتیازات، جغرافیائی حدود کی بنا پر انسانوں کی تقسیم، وغیرہ غیر قرآنی تصورات، ایک ایک کر کے مٹ رہے ہیں۔ یہ سب ڈوبنے والے تارے ہیں۔ اس لئے

سحر قریب ہے۔ اللہ کا نام لے ساقی

یہ ہے حقیقت مخالف قوتوں کی۔ ان کے برعکس، آپ کے پاس قرآن ہے اور قرآن اور نصرتِ خداوندی (یعنی قانونِ خداوندی کی تائید) لازم و ملزوم ہیں۔ اس وقت آپ اس تائید و نصرت سے محروم، فلہٰذا، مایوس، اس لئے ہیں کہ، یکہ قانونِ خداوندی کی نصرت کو اپنے ساتھ ملانے کا طریقہ یاد نہیں رہا۔ تائید و نصرت قانونِ خداوندی کا غیر متبدل اصول یہ ہے کہ آغازِ کار (INITIATIVE) انسانوں کی طرف سے ہونا چاہیئے۔ جونہی ادھر سے آغازِ کار ہوا۔ اُدھر سے "تائید و نصرتِ قانونِ ایزدی کے "ملائکہ" کا نزول شروع ہو گیا۔ ان الذین قالوا ربنا الله ۔ ثم استقاموا ۔ تتنزل علیھم الملائکۃ: "جن لوگوں نے اس محکم اصول کو اپنا نصب العین حیات بنا لیا کہ ہماری ربوبیت کا دامن، قانونِ خداوندی کے ساتھ وابستہ ہے اور پھر اپنی قوتوں میں توازن پیدا کر کے اِس نظام کے قیام کے لئے مصروف عمل ہو گئے تو کائنات کی وہ قوتیں، جو قانونِ خداوندی کے مطابق اعمال کو نتیجہ خیز بنانے پر مامور ہیں ان کی رفیقِ کار ہو گئیں۔ ہماری بھول یہ ہے کہ ہم ابتدا، اُدھر سے چاہتے ہیں اور اس کے انتظار میں، ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہتے ہیں اور جب اس طرح اُدھر سے تائید کی آواز نہیں آتی تو ہم پر ناامیدی کی افسردگی طاری ہو جاتی ہے۔ ہم نہیں سوچتے کہ اس میں قصور خود ہمارا ہی ہے نہ کہ تائیدِ ایزدی کا۔

آپ اِن گزارشات کو اپنے سامنے رکھیئے اور پھر اپنے سینے کو کریدیئے جو اس وقت، خود آوردہ مایوسیوں اور افسردگیوں سے راکھ کا ڈھیر بن رہا ہے اور دیکھئے کہ اس خاکستر کے نیچے وہ چنگاری باقی ہے جس نے کبھی اس نیستانِ نم خوردہ کو شعلہ جوالہ بنا دیا تھا؟ اگر اس میں اس شررِ نغنہ کا نشان مل جائے (اور ہمیں یقین ہے کہ اس کا سراغ ضرور مل جائے گا) تو اسے زندہ رکھنے کی کوشش

دلِ مردہ دل نہیں ہے اسے زندہ کر دوبارہ کہ یہی ہے امتوں کے مرضِ کہن کا چارہ

اور اس کے بعد، حالات کی ناسازگاری مخالفتوں کے ہجوم اور اپنی بے سروسامانی سے نہ گھبرایئے۔ اس لئے کہ شعلہ عشق کی یہ چھوٹی سی چنگاری جو آپ کے سینے میں زندہ و تابندہ ہے، ہزاروں سامانوں پر بھی بھاری ہے کیونکہ یہ اپنی زندگی اور تابندگی کے لئے کسی خارجی قوت کی محتاج نہیں۔ اس کی زندگی خود اس کے سوز دروں سے قائم ہے۔ اس قائم بالذات زندگی کی رمق طرف

تمہارے ہی حصے میں آئی ہے اسلئے حیاتِ مستعار کے پیکرانِ آب و گل، تمہاری اِس زندہ قوت کا مقابلہ کس طرح کر سکتے ہیں۔

نورِ قدیمی! شب را برافروز دستِ کلیمی، در آستینی!

علاوہ بریں جو کچھ آپکو اِس پروگرام کے مرحلۂ اوّل میں کرنا ہے اس کیلئے کسی خاص سروسامان کی ضرورت بھی نہیں۔ طلوعِ اسلام نے اپنے دورِ اوّل میں جو تحریک پیش کی تھی اس میں آپ نے اتنا ہی کیا تھا کہ اسکے پیش کردہ قرآنی مسلک کی عام نشر و اشاعت کی تھی۔ اسی نشر و اشاعت سے یہ تصورات ملک کے گوشے گوشے میں پھیل گئے تھے اور اس کے بعد انہوں نے از خود اتنی قوت پکڑ لی تھی کہ مخالفت کی آوازیں (جو شروع میں ایک عجیب ہنگامہ آرائی اور طوفان خیزی سے اٹھی تھیں) سب خاموش ہو گئیں۔ اس کے لئے نہ کسی سے تصادم کی ضرورت پیش آئی۔ نہ تزاحم کی۔ نہ ٹکراؤ کی، نہ پتھراؤ کی۔ طلوعِ اسلام کی اِس تحریک نے ثابت ہی یہ کیا تھا کہ

ندارد عشق سامانے ولیکن تیشہ دارد تراشد سینۂ کہسار و پاک از خونِ پرویز است

جو کچھ آپ نے اُس وقت کیا تھا، وہی کچھ اَب کرنے کی ضرورت ہے۔ طلوعِ اسلام گذشتہ پانچ سال سے قرآنی نظام کے بنیادی خط و خال کو نہایت واضح الفاظ میں پیش کر رہا ہے۔ لیکن ہنوز یہ تصور ایک خاص دائرے کے اندر محدود ہے۔ اس کی اشاعت عام نہیں ہوئی۔ ضرورت یہ ہے کہ اس پیغام کو ملک کے گوشے گوشے تک پہنچا دیا جائے۔

بعض گرم رَو، بیتاب فطرت، احباب کہہ دیتے ہیں کہ کسی پیغام کے عام کرنے سے کیا ہوتا ہے۔ اصل کام تو انقلاب برپا کرنا ہے۔ لیکن یہ حضرات اپنی گرمجوشی میں اس حقیقت کو فراموش کر دیتے ہیں کہ دنیا میں کوئی انقلاب برپا نہیں ہو سکتا (اور اگر وقتی ہنگاموں سے کوئی تبدیلی پیدا کر دی جائے تو وہ پائیدار نہیں ہو سکتی) جب تک پہلے ذہنی انقلاب نہ پیدا ہو جائے۔ آپ ہندوستان میں، مسلمانوں کی (زیادہ نہیں تو کم از کم) گذشتہ پچاس سالہ تحریکات پر غور کیجئے ان میں سے ہر تحریک بگولے کی طرح اُٹھی، ہزاروں انسانوں کو تباہ و برباد کیا۔ لاکھوں اور کروڑوں روپے کا نقصان ہوا۔ لیکن اِس کے بعد آنسوؤں کی طرح بیٹھ گئی، بایں نمط کہ اس کے بعد (سوائے زخم خوردہ پسماندگان کے) کسی کو یاد تک بھی نہ رہا کہ کوئی ایسا واقعہ رُونما ہوا تھا۔ ایسا کیوں ہوا؟ اسلئے کہ ان تحریکات کو خالص جذبات کے آسرے مشتعل کیا گیا تھا اور ذہنی انقلاب پیدا کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی گئی تھی۔[1] بر عکس اسکے اسلام اپنے آپکو ایک ایسی تحریک کی صورت میں پیش کرتا ہے جسکا تمام تر مدار ذہنی انقلاب پر ہے۔ جو شخص ذہنی طور پر اس تحریک سے متفق نہیں ہوتا وہ اسے اپنے حلقۂ رکنیت میں داخل ہی نہیں کرتا۔ ذہنی انقلاب سے مُراد ہے قلب و نگاہ کی تبدیلی۔ اسی کو اصطلاح میں ایمان کہتے ہیں یعنی پورے غور و خوض کے بعد اس تحریک کے پیش کردہ نصب العین کو اپنی زندگی کا نصب العین قرار دینا۔ اسلام پہلے اس قسم کی جماعت تیار کرتا ہے اور پھر انکے ذریعے خارجی انقلاب برپا کر دیتا ہے۔ بلکہ بالفاظِ صحیح خود اس جماعت کی اجتماعی زندگی ایسا معاشرہ متشکل کر دیتی ہے جو اس تحریک کا نصب العین ہے۔ یعنی اس جماعت کا وجود خود انقلاب ہوتا ہے۔ اس قسم کی ذہنی تبدیلی، بڑی سُست رفتار، صبر آزما اور وقت طلب ہوتی ہے اس لئے تیز مزاج حضرات اس حصۂ پروگرام کو "بے عملی" سے تعبیر کرتے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہی حصۂ پروگرام اصل عمل ہوتا ہے۔ اگر یہ حصہ کمزور رہ جائے تو اس سے وہ شجرِ طیب کبھی نہیں ابھر سکتا جس کے متعلق قرآن کہتا ہے کہ اصلہا ثابت و فرعہا فی السماء۔ اس قسم کے ذہنی انقلاب کے لئے ضروری ہے کہ اس پیغام کو عام کیا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا کی سب سے بڑی انقلاب آور ہستی، حضور نبی اکرمؐ سے بھی سب سے پہلے یہی کہا گیا کہ بلّغ ما انزل الیک (جو کچھ تم پر

[1] تحریکِ پاکستان کی صورت جداگانہ تھی کیونکہ اس کی نوعیت ایک تحریک سے زیادہ عدالت میں پیش شدہ مقدمہ کی سی تھی۔

نازل کیا جاتا ہے اسے دوسروں تک پہنچاؤ) یہی تبلیغ رسالت (اس پیغام کو دوسروں تک پہنچانے کا مرحلہ) پیش خیمہ تھا اس پیغام کی عملی تشکیل کا۔

بعض حضرات کہتے ہیں کہ ہم طلوعِ اسلام کے پیش کردہ پیغام سے متفق ہو چکے ہیں اسلئے ہمیں اب بتایا جائے کہ اگلا قدم کیا ہے؟ ان حضرات سے گذارش ہے کہ آپ کے اس پیغام سے متفق ہو جانے سے مراد نہیں کہ یہ پیغام بھی عام ہو چکا ہے۔ آپ دوسروں کا قیاس اپنے آپ پر کر رہے ہیں آپ اپنی طرف نہ دیکھئے۔ دیکھئے یہ کہ آپ کے گرد و پیش کتنے لوگ ہیں جو آپ کی طرح، اس پیغام کو اپنے دل کی گہرائیوں میں جگہ دے چکے ہیں اور ان کے مقابلے میں کتنے ایسے ہیں جو ہنوز اسی پرانی ڈگر پر چلے جا رہے ہیں۔ جس دن آپ مطمئن ہو جائیں گے کہ ان لوگوں کی اکثریت آپ سے ہمنوا ہو چکی ہے، اس دن ہم بتائیں گے کہ اس سے اگلا قدم کیا ہے۔ اس وقت تو آپ کے لئے اگلا قدم یہی ہے کہ

دیکھا ہے جو خود تم نے، اوروں کو بھی دکھلا دو

یعنی قرآن کے نظامِ ربوبیت کا چرچا عام کرتے جاؤ۔ لیکن قبل اس کے کہ آپ اس پیغام کو اوروں تک پہنچائیں پہلے ایک مرتبہ خود دہرا لیجئے کہ اس پیغام کے بنیادی خط و خال کیا ہیں۔ وہ یہ ہیں:۔

(۱) دنیا میں ہر فرزندِ آدم کے اندر، اللہ کی طرف سے، انسانیت کے جوہر مضمر کر کے رکھ دیئے گئے ہیں۔ یہ جوہر صفاتِ خداوندی (اسماء الحسنیٰ) کے پرتو ہیں اور انہی کی وجہ سے انسان، بہ حیثیت انسان، واجب التکریم ہے۔

(۲) مقصودِ حیات یہ ہے کہ ان مضمر جوہروں کی مکمل نشوونما کی جائے تاکہ انسان زندگی کے موجودہ اور آئندہ مراحل کو بحسن و خوبی طے کرتا ہوا آگے بڑھتا جائے جو قانونِ ارتقاء کا تقاضا ہے۔

(۳) ان انسانی صلاحیتوں کی نشوونما انفرادی طور پر نہیں ہو سکتی اس کے لئے اجتماعی زندگی (معاشرہ کا وجود) ناگزیر ہے۔

(۴) قرآن اس معاشرے کی تشکیل چاہتا ہے جس میں ان صلاحیتوں کی نشوونما ہو سکے۔

(۵) اس مقصد کیلئے اس نے ایسے ابدی اصول عطا کر دیئے ہیں جن میں کوئی تغیر و تبدل نہیں ہو سکتا۔

۶۔ مسلمانوں کا اجتماعی نظام ان ابدی اصولوں کی روشنی میں اپنے اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق جزئی قوانین (BYE-LAWS) مرتب کریگا۔

ان ابدی اصولوں اور انکی روشنی میں مرتب کردہ جزئی قوانین کو شریعت کہتے ہیں یعنی ایک حصہ (اصول) غیر متبدل اور دوسرا حصہ (جزئی قوانین) ہر زمانے کے تقاضوں کے مطابق قابلِ تغیر و تبدل۔

۷۔ قرآنی معاشرے کے وجود کا مقصد یہ ہے کہ وہ ایسے سامان و ذرائع فراہم کرے جن سے تمام افرادِ معاشرہ کی مضمر صلاحیتوں کا نشوونما ہوتا چلا جائے چونکہ انسانی صلاحیتوں کی نشوونما کیلئے انسان کی طبعی ضروریات کا کماحقہٗ پورا ہونا بنیادی شرط ہے اسلئے ہر فردِ معاشرہ کی بنیادی ضروریاتِ زندگی کا بہم پہنچانا اس معاشرے کے ذمے ہے۔ اس معاشرے کی تشکیل ہی اس طرح ہوتی ہے کہ اسمیں ہر فرد، دوسرے فرد کی نشوونما (ربوبیت) کا ذمہ دار بن جاتا ہے۔

(۸) ظاہر ہے کہ اس قسم کے معاشرے کی تشکیل کے لئے رزق کے سرچشمے، انفرادی ملکیت کی بجائے، نظامِ اجتماعی کی تحویل میں ہوں گے تاکہ ان سے تمام افرادِ معاشرہ کی ربوبیت کا انتظام ہو سکے۔

(۹) اس معاشرے میں "حاکم و محکوم" کا تصور نہیں ہوگا بلکہ ہر فردِ معاشرہ خدا کے قانون کا پابند ہوگا جو خود معاشرے کے مشورے سے نفاذ پذیر ہوگا۔

(۱۰) اس نظام کا نام ہے قرآنی نظامِ ربوبیت۔ یعنی خدا کی صفت ربّ العالمین کا عملی مظہر۔ اس نظام کو (پہلے اپنے اندر قائم

کر کے پھر) تمام دنیا تک پھیلا دینا۔ ملتِ اسلامیہ کا فریضہ ہے۔
یہ ہے وہ نظام جس کا قیام طلوعِ اسلام کے پیشِ نظر ہے۔ اس کے لئے پہلا قدم اس تصور کو عام کرنا ہے اور اسوقت طلوعِ اسلام آپ سے اسی کا خواہاں ہے۔

آخر میں ہم، مندرجہ بالا ہر سہ طبقات کے ان تمام مخلص احباب سے کچھ عرض کرنا چاہتے ہیں جن کے دل میں پاکستان کا سچا درد ہے اور جو چاہتے ہیں کہ یہ خطۂ زمین مستقبل کی خوشگواریوں کا گہوارہ بن جائے۔ ہم طبقۂ اوّل (عوام الناس) سے کہیں گے کہ اس میں شک نہیں کہ آپ کی بہبودی اور خوشحالی کے لئے اربابِ بست و کشاد کی طرف سے وہ کچھ نہیں ہوا جو کچھ ہونا چاہیئے تھا لیکن اسکے یہ معنی نہیں کہ آپ خود پاکستان کیطرف سے بددل ہو جائیں۔ ایک بنیادی چیز کو ہمیشہ یاد رکھیئے اور وہ یہ کہ عوام کی حالت کو بہتر بنانے کیلئے صرف حکومت ہی ذمہ دار نہیں ہوا کرتی۔ خود عوام کا اسمیں بہت زیادہ حصہ ہوتا ہے اسلئے آپ اپنی حالت کو بہتر بنانے کے لئے خود بھی کوشش کیجیئے۔ بہت سی باتیں ایسی ہیں جن کی اصلاح آپ خود کر سکتے ہیں۔ کم از کم ان کیلئے تو کسی خارجی امداد کا انتظار نہ کیجیئے۔

یہ بھی سمجھ لیجئے کہ آپ سے جو یہ کہا جاتا ہے کہ اگر پاکستان میں "آئینِ شریعت" کا نفاذ ہو گیا تو عوام کی حالت اسی دن سنور جائے گی۔ یہ بھی فریب ہے اور محض آپ کے ووٹ حاصل کرنے کا ایک ذریعہ۔ اوّل تو جس قسم کا "آئینِ شریعت" ان لوگوں کے ذہن میں ہے اس میں عوام کی حالت نہ کبھی سدھری تھی نہ سدھر سکتی ہے۔ وہ آئین، مفاد پرستی اور سرمایہ داری کا محافظ ہے جس میں عوام کو ہمیشہ لوٹا کھسوٹا گیا ہے۔ اُس آئین میں بھی دنیا کی خوشگواریاں مفاد پرست طبقے کے حصے میں آئیں گی اور آپ کو "آخرت میں جنت" ملنے کی تھپکیاں دے کر سلا دیا جائے گا۔ دوسرے یہ کہ قوموں کی حالت خالی قوانین کے زور نہیں بدلا کرتی۔ اس کیلئے ذہنی تبدیلی کی بڑی ضرورت ہوتی ہے۔ ذہنی تبدیلی صرف قرآنی فکر سے پیدا ہو سکتی ہے اور یہی وہ تبدیلی ہے جس سے صحیح معاشرہ وجود میں آتا ہے۔ قانون کا کام معاشرہ کے مستثنیات (EXCEPTIONS) یعنی جرائم پسند طبائع کی روک تھام ہوتا ہے۔ نہ کہ صحیح معاشرہ کی تخلیق۔ اس لئے آپ کی اصلاح کا راز بھی صرف قرآنی فکر کے، عام ہونے میں ہے۔

اس کے بعد ہم برسرِ اقتدار طبقہ کے مخلص حضرات سے عرض کریں گے کہ اس میں شبہ نہیں کہ مملکتِ پاکستان نئی نئی وجود میں آئی ہے اور اس کے نظم و نسق کو اطمینان بخش سطح تک پہنچنے میں وقت لگے گا۔ لیکن بہت سے کام ایسے بھی ہیں جو آپ حضرات کی تھوڑی سی محنت، فکر اور ایثار سے بہ حسن و خوبی سرانجام پا سکتے ہیں۔ ایسے امور کے لئے یہ عذرات کہ مملکت نئی ہے اور قوم بڑی نااہل ہے، محض اعذارِ بارد ہیں جو زیادہ دیر تک کارگر نہیں ہو سکتے۔ اگر آپ اور کچھ بھی نہیں کر سکتے تو کم از کم عوام کی، موجودہ بھوک ہی کا کچھ علاج کیجیئے۔ اس وقت پاکستان کے بعض علاقوں میں روپے کا ڈیڑھ سیر آٹا ملتا ہے۔ آپ سوچیئے کہ کتنے لوگ ہیں جو اس نرخ پر آٹا خرید کر اپنا اور اپنے بچوں کا پیٹ پال سکتے ہیں؟ یہ حالت روز بروز خراب سے خراب تر ہوتی جا رہی ہے اور اس کے نتائج و عواقب بالکل کھلے ہوتے ہیں۔ حکومت اور عوام کا تعلق باپ اور بچوں کا سا سمجھا جاتا ہے۔ جو باپ اپنے بچوں کا پیٹ نہ پال سکے اسے سوسائٹی میں کبھی عزت کی نگاہوں سے نہیں دیکھا جاتا۔

اب رہے وہ حضرات جو نہایت دیانتداری سے سمجھ رہے ہیں کہ ملک میں "قانونِ شریعت" نافذ ہو جانے سے حالات بدل جائیں گے سو ان کی خدمت میں عرض ہے کہ مسلمانوں کے جن ممالک میں اس وقت مذہبی پیشوائیت کے تصور کا قانون

نافذ ہے ذرا ان ممالک کی حالت پر غور کیجئے اور پھر سوچیئے کہ کیا ان ممالک کی حالت فی الواقعہ اطمینان بخش ہے اور کیا آپ اسی قسم کے حالات یہاں دیکھنا چاہتے ہیں؟ حقیقت یہ ہے کہ ان حضرات کے نزدیک شریعت کے قوانین سے مُراد وہ فقہی قوانین ہیں، جو تعزیراتی یا شخصی قانون (PERSONAL LAWS) کی حیثیت سے نافذ ہوتے ہیں۔ اِس میں شُبہ نہیں کہ ان فقہی جزئیات کو بھی اپنی جگہ اہمیت حاصل ہے لیکن اِسلام جس معاشرتی انقلاب کا مقتضی ہے وہ انقلاب اِن تعزیری احکام کی تنفیذ سے برپا نہیں ہو سکتا۔ اس کے لئے اِسی قرآنی نہج زندگی کی ضرورت ہے جس کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے چونکہ ہماری مذہبی پیشوائیت کے نزدیک اِسلام نام ہی انہی جزئی احکام کا ہے، وہ انہی پر زور دیتا ہے اور اسی لئے زور دیتا ہے کہ اس سے اس کا اپنا اقتدار قائم رہتا ہے۔ ہم ہزار برس سے اس اِسلام کے نتائج دیکھتے چلے آ رہے ہیں۔ کیا آپ ان تاریخی شواہد کی موجودگی میں پھر اسی تجربے کو دہرانا چاہتے ہیں جس نے تمام رُوئے زمین کے مسلمانوں کو اس پستی کی حالت تک پہنچا رکھا ہے؟

اس کے بعد ہم ایک مرتبہ پھر اپنے اس مخاطب طبقے کو سامنے لاتے ہیں جس سے اتنا کچھ پہلے کہا جا چکا ہے۔ ہم پوچھتے ہیں کہ حالات جس حد تک بھی یاس انگیز ہیں، کیا آپ کا اِس پر ایمان ہے یا نہیں کہ قرآن میں یہ صلاحیت ہے کہ وہ ان میں بھی انقلاب پیدا کر سکتا ہے؟ اگر (معاذ اللہ) آپ کا اس پر ایمان نہیں رہا تو پھر آپ سے ہم کچھ نہیں کہنا چاہتے اور اگر آپ کا اس پر ایمان ہے تو پھر سوچیئے کہ کیا آپ پر اس ضمن میں کوئی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی؟ یاد رکھیئے۔ اسوقت پاکستان ہی نہیں بلکہ ساری دنیا قرآن کے پیغام ربوبیت کے لئے تڑپ رہی ہے۔ کیا آپ اِس پیغام کے عام کرنے میں کچھ بھی حصّہ نہیں لیں گے؟

اپنے دل سے فیصلہ کرنے کے بعد پرچہ ایک طرف رکھیئے؟ کیونکہ آپ کے فیصلے پر ایک عظیم القدر مستقبل کا انحصار ہے۔ یہ تھے مملکت پاکستان کے کوائف اور ہمارے مسائل ۱۹۵۲ء میں۔ اس کے بعد یہ دیکھیئے کہ اس بائیس سال کے عرصہ میں ہم نے انہیں حل کیا ہے یا ان میں مزید اضافہ ہو گیا اور حالات کی شدت اور نزاکت اور بھی بڑھ گئی ہے! ہم اپنی طرف سے اس سے زیادہ کچھ نہیں کہنا چاہتے۔

لاہور میں قیام کے لئے

صاف ستھرے ہوادار کمرے مناسب شرح پر۔ نیز عمدہ لذیذ اور پسندیدہ کھانوں کے لئے معیاری طعام گاہ

PARKWAY

پارک وے ہوٹل

HOTEL

(فون نمبر ۵۸۲۵۹)

آپکی تشریف آوری کا شکریہ

مینیجر پارک وے ہوٹل نزد ریلوے سٹیشن لاہور

پرویز صاحب کی معرکہ آرا انگریزی کتاب

ISLAM: A CHALLENGE TO RELIGION

جس نے اپنے ملک کے علاوہ یورپ اور امریکہ کے ارباب فکر و نظر سے بھی خراج تحسین حاصل کیا ہے۔

قیمت :۔ (بکس بورڈ کور) -/۲۰ روپے

قیمت :۔ (خوبصورت جلد کیساتھ) -/۳۰ روپے

(محصول ڈاک اور پیکنگ علاوہ) جلد حاصل کیجئے۔

ناظم۔ ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵/بی گلبرگ ۲ لاہور

طلوعِ اسلام کا مسلک اور مقصد

جسے اس کی اہمیت کے پیشِ نظر وقتاً فوقتاً شائع کیا جاتا ہے

۱۔ قرآن کریم خدا کی آخری کتاب اور قیامت تک تمام نوعِ انسان کے لئے مکمل اور غیر متبدل ضابطۂ حیات ہے۔ حضور نبی اکرمؐ خدا کے آخری نبی اور رسول ہیں۔ نہ قرآنِ کریم کے بعد اور وحی آسکتی ہے اور نہ ہی حضورؐ کے بعد کوئی نبی اور رسول۔ اُمتِ محمدیہ اسلام میں آخری اُمت ہے کیونکہ اس کی نسبت، خدا کے آخری رسُول کی طرف ہے۔

۲۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ طیبہ، تمام نوعِ انسان کے لئے، قیامت تک، بلندیٔ اخلاق اور پاکیزگیٔ کردار کا بہترین نمونہ (اسوۂ حسنہ) ہے جس کے اتباع میں شرفِ انسانیت کا راز پنہاں ہے۔ اسی کو اتباعِ سنت کہا جاتا ہے۔

۳۔ احادیث کے مجموعوں میں صحیح حدیثیں بھی ہیں اور وضعی بھی جو روایت، قرآن کریم کے خلاف ہو یا اس سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ طیبہ یا صحابہ کبار کی عظمت پر کسی قسم کا حرف آتا ہو وہ صحیح نہیں ہو سکتی۔

۴۔ اُمت کے مختلف فرقے اسلامی ارکان (نماز وغیرہ) کو جس طرح ادا کرتے چلے آرہے ہیں، ان میں کسی قسم کے تغیر و تبدل کرنے یا کوئی نیا طریقہ ایجاد کرنے کا کسی کو حق نہیں۔ البتہ اگر کسی وقت خلافتِ علیٰ منہاجِ نبوت کا دوبارہ قیام ہو جائے اور وہ امت میں پھر سے وہی وحدت پیدا کرنے کے لئے جو ابتدائے اسلام میں تھی، ان کے لئے کوئی ایک طریقہ متعین کر دے تو اس سے امت کا موجودہ اختلاف اور انتشار ختم ہو جائے گا۔ نماز میں چونکہ قرآن مجید پڑھا جاتا ہے اس لئے وہ کسی اور زبان (مثلاً اُردو وغیرہ) میں ادا نہیں کی جا سکتی۔

۵۔ جو مملکت اس امر کا اقرار و اعلان کرے کہ اس کا تمام کاروبار قرآنِ کریم کی متعین کردہ حدود کے اندر رہتے ہوئے سرانجام پائے گا اور اس کا فریضہ قوانین خداوندی کا نفاذ ہو گا اور اس مملکت کے چلانے والے سیرتِ محمدیؐ کے قالب میں ڈھلے ہوں، وہ مملکت صحیح اسلامی مملکت کہلائے گی۔ اسی کو خلافت علیٰ منہاج نبوت یا اسلامی نظام کہا جاتا ہے اور اس کی سنٹرل اتھارٹی کو "مرکزِ ملت" کی اصطلاح سے پکارا جاتا ہے۔ اس کا طریق شورائی ہو گا۔

۶۔ خلافت علیٰ منہاجِ نبوت یا اسلامی مملکت میں تمام مسلمانوں کے لئے ایک قانونِ شریعت ہوتا ہے مختلف فرقوں کے لئے مختلف قوانین نہیں ہوتے۔ اس میں مسلمان ایک اُمت کے افراد ہوتے ہیں۔ فرقوں میں بٹے ہوئے نہیں ہوتے۔ رسول اللہؐ کے زمانے میں اُمت میں کوئی فرقہ نہیں تھا۔

۷۔ اس وقت مختلف فرقوں کے اپنے اپنے قوانینِ شریعت ہیں۔ ان میں سے کوئی فرقہ کسی دوسرے فرقے کے قانون کو اسلامی قانون تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں۔ اندریں حالات، تمام مسلمانوں کے لئے واحد اور مشترک اسلامی قانون مدون کرنے کا طریقہ یہی ہے کہ

(i) قرآنِ کریم کو قانون کی غیر متبدل بنیاد قرار دے دیا جائے (مختلف فرقوں کا قرآن الگ الگ نہیں۔ قرآن سب کا ایک ہی ہے لیکن فقہ اور روایات ہر ایک کی الگ الگ ہیں۔)

(ii) قرآنِ کریم کو بنیاد قرار دے کر، مختلف فرقوں کی فقہ اور روایات کو سامنے رکھا جائے اور ان کی روشنی میں اربابِ علم و بصیرت کی مشاورت سے ایسا قانون مرتب کیا جائے جو ہمارے زمانے کی ضروریات کو پورا کرے۔ اس کے سوا، اُمت میں وحدت پیدا کرنے اور مسلمانوں کو ایک مرکز پر لانے کی کوئی صورت نہیں۔

۸۔ طلوعِ اسلام کا مسلک ہنگامے برپا کرنا نہیں، بلکہ دلائل و شواہد اور علم و بصیرت کی رُو سے قرآنِ کریم کی تعلیم اور حضورؐ کے اسوۂ حسنہ کو اس طرح پیش کرنا ہے جس سے قلب اور دماغ میں صحیح تبدیلی پیدا ہو جائے کیونکہ اس قسم کی تبدیلی کے بغیر سیرت و کردار میں تبدیلی پیدا نہیں ہو سکتی۔

۹۔ طلوعِ اسلام کا تعلق نہ کسی سیاسی پارٹی سے ہے، نہ مذہبی فرقہ سے نہ عملی سیاست میں حصہ لینا اس کے پروگرام میں ہے — پاکستان کا استحکام — ملت کی وحدت اور قرآنِ کریم کی بنیاد پر صحیح اسلامی نظام کا قیام، اس کا نصب العین ہے۔ اس نظام کی اوّلین خصوصیت یہ ہے کہ اس میں کوئی فرد اپنی بنیادی ضروریاتِ زندگی سے محروم نہیں رہتا۔ اس میں وہ ہر نوع غلامی سے آزاد ہو جاتا ہے)۔ طلوعِ اسلام کا مقصد یہ ہے کہ پاکستان کے سوچنے والے طبقہ کے دل و دماغ میں ایسی تبدیلی پیدا کی جائے جس سے وہ یہاں آئینی طور پر صحیح اسلامی نظام متشکل کر سکیں۔

۱۰۔ اس مقصد کے لئے طلوعِ اسلام کسی سے کچھ نہیں مانگتا۔ البتہ جو حضرات بطیبِ خاطر اس مقصد سے متفق ہوں وہ انہیں دعوت دیتا ہے کہ وہ اس فکر کی نشر و اشاعت کے لئے اس سے تعاون کریں۔

ناظم ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵/بی گلبرگ ۲ لاہور

غیر مستطیع حضرات کے لئے ایک خصوصی پیشکش

ہمارے پاس اکثر ایسے احباب کے خطوط آتے رہتے ہیں جو باہتمام طلوعِ اسلام کا باقاعدہ مطالعہ کرنا چاہتے ہیں لیکن ان میں اتنی استطاعت نہیں ہوتی کہ پیسے بھی چندہ ادا کر سکیں۔ قرآنی فکر سے وابستہ ایک مخیر دوست نے یہ پیشکش کی ہے کہ اگر ایسے غیر مستطیع شائقین نصف چندہ (یعنی ساڑھے سات روپے) ادا کر دیں تو وہ بقایا ساڑھے سات روپے اپنی طرف سے ادا کر دینگے اور یوں انکے نام سال بھر کیلئے طلوعِ اسلام جاری ہو جائے گا۔ (سرکاری اور دینی درسگاہوں کے طلباء نیز ائمہ مساجد و اساتذہ حضرات کو ترجیح دی جائیگی۔ اس رعایت سے فائدہ اٹھانے والے حضرات ساڑھے سات روپے بذریعہ منی آرڈر ہمیں بھیج دیں رسالہ انکے نام سال بھر کے لئے جاری کر دیا جائے گا۔

(ناظم ادارہ طلوعِ اسلام)

باب المراسلات

۱۔ (مرحوم) صدر ایوب کی یاد میں

طلوعِ اسلام کی جون ۱۹۷۴ء کی اشاعت میں، ہم نے (مرحوم) صدر ایوب کی تقاریر اور بیانات کے اقتباسات تفصیل کے ساتھ شائع کئے تھے۔ اس پر ہمیں اپنے دو ایک قارئین کی طرف سے خطوط موصول ہوئے ہیں، جن میں (شکوہ اور طنز کے انداز میں) کہا گیا ہے کہ ان تقاریر کی اشاعت کے ساتھ ہمیں یہ بھی لکھنا چاہیئے تھا کہ مرحوم اس قدر اختیارات اور اقتدارات کے مالک ہوتے ہوئے ان خیالات کو عمل میں کیوں نہ لائے؟

معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے ان قارئین نے، طلوعِ اسلام کا مطالعہ حال ہی میں شروع کیا ہے۔ اگر دورِ ایوبی کا طلوعِ اسلام بھی ان کی نظروں سے گذرا ہوتا تو انہیں اس شکوہ یا طنز کی ضرورت نہ پڑتی۔ ان احباب کو معلوم ہونا چاہیئے کہ طلوعِ اسلام کا شعار اربابِ اقتدار کی مدح سرائی اور قصیدہ خوانی نہیں۔ اس کا مسلک یہ ہے کہ ہر شخص کے اچھے کاموں کی تحسین کی جائے اور (خواہ وہ کتنے ہی بڑے اقتدار کا مالک کیوں نہ ہو) اس کے غلط اقدامات پر اسے ٹوکا جائے جو بات ہمارے ان مراسلہ نگاروں نے اب کہی ہے (اور کسی کے مرنے کے بعد اس پر تنقید کرنا بہت آسان ہوتا ہے۔ ہم نے وہ بات صدر ایوب کے سامنے، اور وہ بھی ان ایام میں کہی تھی جب ان کا اقتدار انتہائی عروج پر تھا۔ ہم نے، عسکری انقلاب کی یاد میں، اکتوبر ۱۹۶۶ء میں ایک تفصیلی مقالہ شائع کیا جس کا عنوان تھا۔

؎ خوش بختی دستک دے رہی ہے۔

اس کا آغاز اس طرح ہوتا تھا:

"یوسف زلیخا" (پنجابی) کے مصنف، مولانا غلام رسول، ایک قلبِ گداز رکھنے والے صاحبِ قلم تھے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ وہ بعض مقامات پر ایسے انداز سے بات کر جاتے ہیں جس سے دل میں ارتعاش پیدا ہو جاتا ہے اسی قسم کا ایک مقام ہے جہاں (حضرت) یوسف مصر کے بازار میں بیچے جا رہے تھے زلیخا اس سے پہلے، نادیدہ ان پر عاشق ہو چکی تھی اور انہیں اکثر اپنے خوابوں میں دیکھا کرتی تھی۔ وہ بھی اس منڈی میں آ نکلتی ہے اور جونہی اس کی نگاہ، اس بکنے والے غلام پر پڑتی ہے وہ وجد و کیف کے عالم میں کھو جاتی ہے کہ یہ تو وہی جانِ زلیخا ہے جس کے فراق میں وہ اتنے عرصہ سے تڑپ رہی تھی۔ زلیخا مصر کے بہت بڑے سردار کی بیوی ہے۔ اس لئے دولت کی اس کے پاس کچھ کمی نہیں۔ اس منظر کشی کے بعد، مولانا غلام رسول لکھتے ہیں کہ:۔

جس نوں یار وکیندا لبھے، نِت قیمت ہووے پلے　　اس دے جیڈ نہ طالع کوئی، اس دے بھاگ سوتے

جسے محبوب بازار میں بکتا ملے اور اس کی گرہ میں اسے خریدنے کے لئے دام بھی ہوں اس جیسا خوش نصیب دنیا میں کوئی اور نہیں ہو سکتا۔ وہ بڑا ہی طالع مند ہے۔

اب آپ بازار مصر سے شاہراہِ پاکستان کی طرف آجائیے۔

اس کے بعد صدر (مرحوم) کی تقاریر اور بیانات درج کی گئیں۔ اور ان کے بعد لکھا:۔

خوش بختی یا حرماں نصیبی

"یہاں سے آپ پھر بازارِ مصر کی طرف لوٹ چلیئے۔ یوسفؑ سرِ بازار بک رہا ہو زلیخا کے پاس اسے خریدنے کے لئے دام بھی ہوں اور وہ اسے خریدے بغیر گھر واپس چلی جائے، تو آپ زلیخا کی اس حرماں نصیبی کے متعلق کیا کہیں گے؟ صدرِ مملکت محترم محمد ایوب خان صاحب کے خیالات، نظریات، معتقدات، بلکہ ان کا ایمان ان کی خواہشیں ان کی آرزوئیں، ان کی تمنائیں جن کا وہ شدّ و مد سے اظہار کرتے چلے آرہے ہیں، یہ ہوں۔ اور پھر ان کے پاس اقتدار بھی اتنا وسیع ہو کر جب جی چاہے انہیں عملی پیکر عطا کر دیں ــــ پہلے چھ سال تک یہاں مارشل لاء نافذ رہا جس سے زیادہ ذی اختیار دَور، تصور میں بھی نہیں آسکتا۔ اور اس کے بعد ملک میں صدارتی نظام قائم ہوا جس میں سربراہِ مملکت کے اختیارات کچھ کم نہیں ہوتے۔ یہ ہوا اختیارات کی وسعت ــــ لیکن اس کے باوجود ان کے یہ تصورات، تقاریر اور بیانات کی حد سے آگے نہ بڑھیں، تو اس کے متعلق، بجز اس کے کہ ایک سرد آہ کھینچ کر رہ جائیں۔ ہم اور کیا کہہ سکتے ہیں۔ ہم نے جنوری سنہ ۱۹۶۱ء میں کچھ ایسے ہی احساسات کے تابع لکھا تھا۔

ہم جناب محترم المقام صدرِ مملکت پاکستان فیلڈ مارشل محمد ایوب خان کی خدمت میں بصد ادب و احترام گذارش کریں گے کہ فطرت نے آپ کو ایک ایسے بلند مقصد کے لئے منتخب کیا ہے جس کی نظیر ہماری ہزار سالہ تاریخ میں کہیں نہیں ملتی۔ یہ مقصد جس کے لئے اقتدار آپ کے ہاتھوں میں منتقل ہوا ہے مملکت میں صحیح اسلامی نظام کا نفاذ ہے۔ اگر یہ مقصد آپ کے ہاتھوں پورا ہو گیا تو یقین مانیں، آپ کا نام جریدۂ عالم میں سورج کی کرنوں سے لکھا جائے گا۔ تاریخ انسانیت آپ کو زمرۂ اقوام میں بلند ترین مقام عطا کرے گی اور خدا اور اس کی کائناتی قوتیں آپ پر صلوٰۃ و سلام بھیجیں گی۔! سابقہ اربابِ حل و عقد نے فطرت کی اس عظیم و جلیل پیش کش کی قدر نہ کی ــ خدا کرے آپ ان میں منفرد ثابت ہوں اور جو مسند بلند اب تک خالی پڑی ہے اس پر فائز المرام ہونے کا شرف حاصل کر سکیں اور جب آپ بحضورِ داورِ دادار جائیں تو خود اسلام آگے بڑھ کر آپ پر یہ کہتے ہوئے تبریک و تہنیت کے پھول برسائے کہ

یہ ہے وہ مردِ بلند ہمت جس کی قوتِ بازو

سے زمانہ میں میرا "سکہ" رواں ہوا!"

آج ہم اپنی اس عرضداشت کو پھر دہراتے ہوئے صدر محترم کی خدمت میں بصد ادب عرض کرنے کی جرأت کرتے ہیں کہ اقتدار تو ایک طرف، خود انسانی زندگی ہی کا کچھ اعتبار نہیں۔ اور اقبال کے الفاظ میں:۔

ے یہ مال و دولت دنیا، یہ رشتہ و پیوند
بتانِ وہم و گماں لاالٰہ الا اللہ

اللہ تعالیٰ نے آپ کو یہ نادر موقع عطا کیا ہے۔ اِس سے فائدہ اُٹھایئے اور مملکتِ پاکستان میں اِس قرآنی نظام کو رائج کر جایئے جسے دیکھنے کے لئے پورا عالمِ انسانیت چشم براہ ہے۔ اس سے آپ ملتِ پاکستانیہ کی آنکھوں کے تارے، اور انسانیت کے محسن اعظم بن جائیں گے۔ تاریخ کے اوراق پر آپ کے نقوشِ قدم، ابدیت درکنار ہونے کی سعادت حاصل کرلیں گے اور خدا کے ہاں آپ کا شمار اس کے صالحین کے زمرے میں ہوگا۔ آگے بڑھیئے اور، خوش نصیبی کے اِس ساغرِ سیمیں کو دونوں ہاتھوں سے اٹھا لیجئے "یوسف" بازار میں بار بار نہیں بکا کرتے۔ زمامِ اقتدار آپ کے ہاتھ میں آئی ہے تو خدا کے اِس ارشادِ گرامی کو ہمیشہ اپنے سامنے رکھیئے کہ:۔

ثُمَّ جَعَلْنٰكُمْ خَلٰٓئِفَ فِى الْاَرْضِ مِنْۢ بَعْدِهِمْ لِنَنْظُرَ
كَيْفَ تَعْمَلُوْنَ ٥ (۱۰/۱۴)

پھر تمہارے پیش روؤں کے بعد ہم نے زمامِ حکومت تمہارے ہاتھ میں دی تاکہ
ہم دیکھیں کہ تم کس قسم کے کام کرتے ہو۔

یاد رکھئے! خدا کا اٹل قانون کسی کی رعایت نہیں کیا کرتا۔ لہٰذا ے

خیرے کُن اے فلاں و غنیمت شمار عمر
زاں پیشتر کہ بانگ برآید فلاں نماند!

ہمیں اُمید ہے کہ اس سے ہمارے ان قارئین کے سامنے یہ حقیقت آگئی ہوگی کہ طلوعِ اسلام اربابِ اقتدار کی مدح سرائی نہیں کرتا۔ تبیانِ حقیقت کے بعد ان کے غلط اقدام پر ٹوکتا بھی ہے، اور صحیح خیالات کو عملی پیکروں میں لانے کی تاکید بھی کرتا ہے۔ یہی رہا ہے ازل سے قلندروں کا طریق۔

اِس ضمن میں ایک اہم حقیقت کا پیشِ نظر رکھنا ضروری ہے۔ اچھی باتیں کہنے والے کے لئے ضروری ہے کہ وہ (بقدرِ وسعت و استطاعت) ان پر عمل بھی کرے، لیکن اگر وہ ان پر عمل نہیں کرتا تو اس کے یہ معنی نہیں کہ اس کی اچھی باتیں، بُری باتیں ہوجاتی ہیں۔ وہ تو اپنی جگہ اچھی ہی رہتی ہیں۔ البتہ اس سے اِن پر عمل نہ کرنے کا بارگاہِ خداوندی میں، مواخذہ ہوگا۔

بعض لوگ، اپنی بے عملی پر پردہ ڈالنے کے لئے کہہ دیتے ہیں کہ صاحب! یہ اچھی باتیں کہنے والا ان پر خود عمل نہیں کرتا، اس لئے اس کی کوئی بات قابلِ قبول نہیں ہوسکتی۔ جیسا کہ کہا جا چکا ہے، وہ ایسا اپنی بے عملی کو چھپانے کے لئے کہتے ہیں۔ اگر وہ شخص اپنی اچھی باتوں پر عمل نہیں کرتا۔ تو اس کا مؤاخذہ اس سے ہوگا۔ لیکن آپ کو کس نے روکا ہے کہ آپ اس کی ان باتوں پر عمل نہ کریں، جنہیں آپ اچھا سمجھتے ہیں۔

(مرحوم) صدر ایوب اپنے اچھے خیالات و افکار کو عمل میں نہ لائے۔ اس کا ان سے مؤاخذہ ہوگا۔ لیکن ہمیں کیا ہوگیا ہے کہ ہم ان کی اچھی باتوں کو اچھا نہ کہیں، یا ان پر عمل نہ کریں اور دیگر اربابِ اقتدار سے یہ نہ کہیں کہ وہ بھی اِس قسم کے بلند پایہ خیالات رکھیں اور ان پر عمل کریں۔

حقائق و عبر

۱۔ حکومت کے حواسِ خمسہ

انسانی ذہن اُن اطلاعات کے مطابق فیصلہ کرتا ہے جو اُسے حواسِ خمسہ بہم پہنچاتے ہیں۔ اگر ان حواس میں سے کوئی حِس ماؤف ہو جائے تو اُس سے متعلقہ کوئی اطلاع دماغ تک نہیں پہنچ سکتی اور اگر اس میں کوئی خرابی واقع ہو جائے تو پھر دماغ تک غلط اطلاع پہنچتی ہے اور اس وجہ سے اُس کا فیصلہ بھی صحیح نہیں ہوتا مثلاً اگر بیماری میں منہ کا ذائقہ کڑوا ہو جائے تو ذہن کسی نئی چیز کے متعلق فیصلہ ہی نہیں کر سکتا کہ اس کا اصلی ذائقہ کیا ہے وہ شہد کو بھی کڑوا ہی بتائے گا۔ اسی سے دیگر حواس پر بھی قیاس کیا جا سکتا ہے۔

جو حیثیت انسانی جسم کے سلسلے میں اُس کے حواس کی ہے، کاروبارِ حکومت کے سلسلے میں وہی حیثیت حکومت کی خبر رساں ایجنسیوں کی ہے۔ ان میں حکومت کے نزدیک معتبر ترین ایجنسی وہ ہوتی ہے جسے عرفِ عامہ میں سی آئی ڈی کہتے ہیں۔ حکومت کے تمام فیصلوں کا مدار اس ایجنسی کی پہنچائی ہوئی خبروں پر ہوتا ہے۔ انہی کی رُو سے افراد، جماعتوں، بلکہ مملکت تک کی قسمت کے فیصلے ہوتے ہیں۔ انہی کی رُو سے افراد اور جماعتوں پر بڑے بڑے سنگین الزام عائد کئے جاتے ہیں اور پھر تفتیش کے دوران اُن پر جو بیتتی ہے، اُن کے تصور سے بھی روح کانپ اُٹھتی ہے اور آخر الامر ان میں سے اکثر بے گناہ ثابت ہو جاتے ہیں۔ انہی کی بنیاد پر پارٹیوں کو غداری اور بغاوت تک کی سازشوں کا ملزم تصور کیا جاتا ہے۔ حتیٰ کہ انہی کے انحصار پر دوسری مملکتوں کے ساتھ اپنی مملکت کے تعلقات کا فیصلہ کیا جاتا ہے۔ اس سے آپ نے اندازہ کر لیا ہو گا کہ ایک معاشرے، نظام، یا حکومت کی مشینری میں ان ذرائع معلومات کی اہمیت کس قدر ہے اور اسی سے اس کا بھی اندازہ لگا لیجئے کہ اگر ان میں کوئی خرابی واقع ہو جائے تو اس کے نتائج کس قدر مہلک ہو سکتے ہیں۔ ہمارے ہاں عام طور پر، اُن ذرائع کی کیفیت کیا ہے، اُس کا ایک ہلکا سا اندازہ اُس واقعہ سے لگایا جا سکتا ہے جو پچھلے دنوں یہاں منظرِ عام پر آیا۔ واقعہ بڑا معمولی سا ہے لیکن جو بات ہم نے اوپر کہی ہے اُس سلسلے میں اُس کی اہمیت بہت بڑھ جاتی ہے۔

اوائل جون میں تحریک ختمِ نبوت کے سلسلے میں لاہور میں بعض علماء کی گرفتاریاں ہوئیں۔ ان حضرات نے مسجد وزیر خاں میں جلسہ کرنے کا اعلان کیا تھا اور پولیس انہیں مسجد سے باہر ہی اپنی حراست میں لے لینا چاہتی تھی۔ انہوں نے کئی ایک علماء کو گرفتار کر لیا۔ اس سلسلے میں پنجاب کے وزیرِ اعلےٰ محترم حنیف رامے نے صوبائی اسمبلی کے اجلاس میں بیان کیا کہ (ان علماء کی حالت یہ ہے کہ) جب یہ گرفتاریاں ہو رہی تھیں تو دیکھا گیا کہ چار آدمی ایک

چارپائی اپنے کندھوں پر اٹھائے چلے آرہے ہیں اور اُس پر جو شخص لیٹا ہے اُسے چادر سے ڈھانپ رکھا ہے۔ وہ اُس چارپائی کو مسجد میں لے جانا چاہتے تھے۔ پولیس کو شُبہ گذرا۔ انہوں نے انہیں روکا۔ چادر کو اٹھایا تو کیا دیکھتے ہیں کہ اُس کے نیچے مولانا عبید اللہ انور لیٹے ہوئے ہیں چنانچہ پولیس نے انہیں اسی حالت میں گرفتار کر لیا۔

وزیرِ اعلیٰ صاحب کا یہ بیان ایوانِ اسمبلی سے باہر آیا اور ملک بھر میں اِس کا چرچا ہو گیا۔ واضح رہے کہ مولانا عبید اللہ انور کوئی غیر معروف شخصیت نہیں، وہ طبقۂ علماء میں ایک ممتاز حیثیت کے حامل ہیں اور لاہور میں انہیں بچہ بچہ جانتا پہچانتا ہے۔ پھر، وزیرِ اعلیٰ صاحب نے جو واقعہ بیان فرمایا وہ کسی ویرانے میں نمودار نہیں ہوا۔ مسجد وزیر خان کے دروازے پر جہاں معمولاً بھی سینکڑوں لوگوں کا اجتماع رہتا ہے اور اُس ہنگامے میں وہاں ہزار ہا لوگ جمع تھے۔ اُن سب کی موجودگی میں، دن کے وقت، یہ مبیّنہ واقعہ ظہور میں آیا۔ لیکن اگلے ہی روز مولانا عبید اللہ انور صاحب نے اپنا بیان شائع کیا جس میں کہا کہ :-

جناب حنیف رامے نے پنجاب اسمبلی میں تقریر کرتے ہوئے میرے بارے میں، جو باتیں کی ہیں۔ مجھے اُن پر انتہائی رنج اور صدمہ ہوا ہے۔ انہوں نے پورے ملک میں میرے متعلق ایک خاص تاثر پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ اصل واقعہ یہ ہے کہ مسجد وزیر خان میں جلسہ منعقد کرنے کے فیصلہ کا اعلان پریس کانفرنس میں کیا گیا۔ سارے شہر میں منادی کرائی گئی اور اشتہارات تقسیم ہوئے۔ اِس کے بعد وقتِ مقررہ پر میں اپنے رفقاء کے ساتھ مسجد کے دروازے تک پیدل پہنچا۔ اس موقع پر ہزاروں افراد اور اخباری نمائندے موجود تھے۔ اِن حقائق کی روشنی میں عوام اندازہ کر سکتے ہیں کہ اس اجتماع کے سلسلے میں کوئی بات پس پردہ نہیں رکھی گئی اور کسی مرحلہ پر کوئی زیرِ زمین سرگرمی نہیں برتی گئی نہ ہی مسجد تک پہنچنے کے لئے سوانگ رچایا گیا۔ پھر خدا معلوم یہ چارپائی پر چار آدمیوں سے اٹھا لانے والا افسانہ کس مصلحت کے تحت تراشا گیا (ہفتہ وار " خدام الدین " ۱۴ جون ۱۹۷۴ء ٹائیٹل کا پیج)

محترم وزیرِ اعلیٰ نے اِس پر اظہارِ تاسف کیا۔ مولانا صاحب سے معافی مانگی اور کہا کہ میرا بیان سی آئی ڈی کی بہم پہنچائی ہوئی اطلاع پر مبنی تھا۔

ہم نے اِس واقعہ کا اعادہ اِس لئے کیا ہے کہ یہ واضح کیا جائے کہ حکومت کی اِن خبر رساں ایجنسیوں کا قابلِ اعتماد ہونا کس قدر ضروری ہے اور ان کی بہم پہنچائی ہوئی اطلاعات کے نتائج کس قدر دُور رس ہو سکتے ہیں۔ حنیف رامے صاحب نے مولانا صاحب سے معافی مانگ کر بڑی شرافت کا ثبوت دیا لیکن بات رامے صاحب اور مولانا صاحب تک محدود نہیں، کیا معلوم کہ اِن ذرائع اطلاعات کی مہیا کردہ خبروں کی رُو سے حکومت کیسے کیسے اہم فیصلے کرتی ہو گی اور اُن فیصلوں میں کتنی کتنی بڑی غلطیوں کا امکان ہو سکتا ہے۔ پھر بحیثیت مسلمان، ہمیں اس حقیقت کو بھی مدِّ نظر رکھنا چاہیئے کہ یہاں تو انسان اظہارِ تاسف سے چھوٹ سکتا ہے لیکن بارگاہِ خداوندی میں تو یہ معذرت قابلِ قبول نہیں ہو سکتی۔ وہاں تو فیصلہ کرنے والے کو ہر فیصلے کا ذمہ دار ٹھہرایا جائے گا۔ وہاں وہ یہ کہہ کر نہیں چھوٹ سکے گا کہ مجھے فلاں نے غلط اطلاع بہم پہنچائی تھی۔

اور ہم سمجھتے ہیں کہ ذمہ داری کا یہی وہ شدید احساس تھا کہ جب حضرت عمرؓ سے اُن کے آخری وقت یہ پوچھا گیا۔

کہ کیا آپ کے بعد ہم آپ کے صاحبزادہ ۔ حضرت عبداللہؓ کو خلیفہ منتخب کرلیں تو آپ نے فرمایا کہ بابا! خطاب کے خاندان نے تمہارا کیا بگاڑا ہے کہ تم ایسی زنجیریں ان کے گلے میں ڈال رہے ہو! خدا کی بازپرس سے تمہی چھوٹ جاتے تو غنیمت سمجھو۔ چہ جائے کہ یہ سلسلہ اُس کے خاندان میں آگے تک بڑھتا جائے۔

۲۔ قرآنی تعلیمات کی متفقہ تشریح

پچھلے دنوں کوالالمپور میں منعقد ہونے والی اسلامی کانفرنس کا افتتاح کرتے ہوئے ملائشیا کے وزیر اعظم ٹن عبدالرزاق صاحب نے اپیل کی کہ قرآن کریم کی حکمت کو سمجھنے اور اُس کی تشریح کرنے کے لئے مشترکہ مطالعہ اور تحقیق کی جائے۔ آخر میں انہوں نے اِس بات پر زور دیا کہ "قرآنی تعلیمات کی متفقہ تشریح ہونی چاہیئے"

(بحوالہ نوائے وقت۔ مؤرخہ ۲۲ جون ۱۹۷۴ء)

محترم ٹن عبدالرزاق صاحب کی یہ تجویز بڑی مستحسن ہے کہ دنیا بھر کے مسلمانوں کے ارباب علم و تحقیق کو چاہیئے کہ قرآن کریم کا مشترکہ مطالعہ اور علوم حاضرہ کی روشنی میں اُس کی تحقیق کریں۔ لیکن اُن کی اس تجویز کے آخری حصہ سے (جن الفاظ میں وہ ہمارے سامنے آئی ہے) ایک غلط فہمی پیدا ہونے کا امکان ہے جس کا ازالہ نہایت ضروری ہے۔

قرآنی تعلیمات کے اصولی طور پر دو گوشے ہیں۔ ایک گوشہ وہ ہے جس میں اُمت کے لئے احکام اور اصولاً قانون دیئے گئے ہیں۔ اس گوشے سے مقصود یہ تھا کہ اِن کی روشنی میں ایک ایسا ضابطۂ آئین و قوانین مرتب کیا جائے جو تمام دنیا کے مسلمانوں کے لئے واحد، متفق علیہ ضابطۂ قوانین ہو۔ یہ ضابطہ قوانین اسلامی مملکت کی طرف سے نافذ ہو اور اس طرح ساری اُمت میں وحدت فی العمل پیدا ہو جائے۔ اسلام کے صدرِ اوّل کے بعد آج تک یہ نہ کیا گیا جس کی وجہ سے اُمت اُس افتراق اور انتشار کا شکار ہو گئی جس کے نتائج ہمارے سامنے ہیں۔ ضرورت اِس امر کی ہے کہ مختلف ممالک کی مسلمان مملکتوں کے نمائندے اِس قسم کا ضابطہ مرتب کریں اور اس کا اطلاق تمام امت پر یکساں ہو یہی قرآن کا مقصود اور دین کا مطلوب ہے۔

۲۔ قرآن کا دوسرا گوشہ وہ ہے جس کا تعلق حقائق کائنات اور مابعد الطبیعات حقیقتوں سے ہے اِن پر غور و فکر کی تاکید قرآن کریم نے بار بار کی ہے ظاہر ہے کہ یہ غور و فکر نہ کسی خاص فرد کی اجارہ داری ہو سکتا ہے اور نہ ہی کسی خاص گروہ یا ملک تک محدود ہے۔ دعوت بھی عام ہے اور اسکی تاکید بھی ہر مسلمان کیلئے یکساں اس غور و تدبر کی صحیح شکل یہی ہے کہ مختلف علوم و فنون کے ماہرین اور ارباب تحقیق مشترکہ طور پر قرآن کریم کے متعلقہ حقائق پر غور و فکر کریں لیکن انکی تحقیقات کے ماحصل یا نتیجہ کے متعلق یہ نہیں سمجھ لینا چاہیئے کہ وہ حرفِ آخر ہوگا اور اسکا صحیح ماننا ہر مسلمان کا دینی فریضہ جو اس سے اختلاف کریگا اُس پر کفر کا فتویٰ عائد ہو جائیگا۔ قرآنی حقائق پر غور و فکر کا دروازہ قیامت تک کیلئے ہر شخص کے لئے کھلا ہے اسلئے (جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے) نہ کسی فرد یا گروہ کی تحقیق قولِ فیصل قرار پا سکتی ہے اور نہ کسی خاص دور کی فکر کا ماحصل حرفِ آخر پھر یہ بھی واضح رہے کہ اس قسم کی تحقیق کا اختلاف علمی اور فکری اختلاف ہوگا امت کی وحدت پر اس کا کوئی اثر نہیں پڑے گا۔ امت کی وحدت تو اُس ضابطۂ آئین و قوانین کی اطاعت کی رُو سے متشکل اور مستحکم ہوگی۔ جس کا اطلاق تمام افرادِ اُمت پر یکساں ہوگا۔

۳۔ چند وضاحت طلب نکات

کراچی سے شائع ہونے والے ماہنامہ البلاغ کی اشاعت بابت جولائی ۱۹۷۴ء میں ایک اہم اور، دلچسپ خط و کتابت شائع ہوئی ہے۔ (واضح رہے کہ اس مجلہ کے مدیر مفتی محمد شفیع صاحب کے صاحبزادے محترم محمد تقی صاحب ہیں) اس میں پہلے محترم محمد افضل چیمہ صاحب، سیکرٹری وزارتِ قانون اسلام آباد کی چٹھی مورخہ ۲۹ مارچ ۱۹۷۴ء شائع ہوئی ہے جس میں انہوں نے (غالباً) ملک کے مختلف علماء حضرات سے اس باب میں مشورہ طلب کیا ہے کہ وہ اقدامات کون سے ہیں جن سے پاکستان کے مسلمان اپنے نظامِ زندگی کو اسلامی تعلیمات کے مطابق ڈھال سکیں کیونکہ یہ چیز اب آئینی وجوب کی حیثیت لئے ہوئے ہے۔ محترم مفتی محمد شفیع صاحب کا طویل جواب اُسی رسالہ میں شائع ہوا ہے۔ یوں تو اُس میں بہت سے امور بحث طلب ہیں لیکن دو چار نکات ایسے ہیں جن کی وضاحت کے لئے ہم محترم مفتی صاحب سے درخواست کرتے ہیں۔

۱۔ قانون کی اصلاح کے سلسلے میں مفتی صاحب نے ارشاد فرمایا ہے کہ:۔

> اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے مسلمانوں کے پاس ایک ایسا قانون موجود ہے جو بلاشبہ دُنیا کے ہر قانون سے زیادہ مستحکم اور مضبوط ہے اور اسے نافذ کئے بغیر دنیا عدل و انصاف اور امن و سکون سے ہمکنار نہیں ہو سکتی۔ البتہ ضرورت اِس بات کی ہے کہ اسے جدید تقاضوں کے مطابق مدون و مرتب کر دیا جائے اور عصرِ حاضر میں جو نئے مسائل پیدا ہوتے ہیں، قرآن و سنت اور اجماع و قیاس کی روشنی میں، ان کا حل تلاش کیا جائے۔ مفتی صاحب نے پہلے یہ فرمایا ہے کہ "مسلمانوں کے پاس ایک ایسا قانون موجود ہے جو بلاشبہ دنیا کے ہر قانون سے زیادہ مستحکم اور مضبوط ہے اور اس کے ساتھ ہی یہ بھی فرمایا ہے کہ اُسے جدید تقاضوں کے مطابق مدون اور مرتب کر دیا جائے۔ یہ بات سمجھ میں نہیں آئی کہ جو قانون پہلے سے موجود ہے اُسے جدید تقاضوں کے مطابق مدون اور مرتب کرنے سے مراد کیا ہے؟ کیا وہ قانون مدون اور مرتب شکل میں نہیں ہے؟ جہاں تک ہم سمجھ سکے ہیں، مفتی صاحب کا مطلب یہ ہے کہ وہ قانون (جس سے غالباً فقہ حنفی مُراد ہے) مدون اور مرتب شکل میں موجود تو ہے لیکن ضرورت اِس اَمر کی ہے کہ اُس میں جدید تقاضوں کے مطابق ترمیم و تنسیخ اور حک و اضافہ کر دیا جائے کیا مفتی صاحب فرمائیں گے کہ ہم اُن کا مطلب صحیح سمجھے ہیں۔
>
> نئے مسائل کے متعلق مفتی صاحب نے فرمایا ہے کہ ان کا حل قرآن و سنت اور اجماع و قیاس کی روشنی میں تلاش کیا جائے۔ قرآن کریم کے متعلق تو معلوم ہے کہ یہ ایک مرتب کتاب کا نام ہے۔ اگر وہ یہ فرما دیں کہ، "و سنت، اجماع اور قیاس" کا مفہوم کیا ہے اور ان چہار مآخذ (قرآن، سنت، اجماع اور قیاس) میں سے ہر ایک کا قانون سازی کے سلسلے میں مقام کیا تو اس سے بات واضح ہو جائے گی اور قانون سازی کا مرحلہ آسان۔

۲۔ مفتی صاحب نے ایک جگہ فرمایا ہے کہ:۔

> دین و مذہب کے معاملہ میں جہالت کا تو یہ عالم ہے کہ اعلیٰ تعلیم یافتہ افراد بھی دین کی ابجد تک سے واقف نہیں۔

مفتی صاحب نے "دین اور مذہب" ایسے لکھا ہے جیسے یہ کوئی دو الگ الگ چیزیں ہوں۔ کیا وہ فرمائیں گے کہ اس سے اُن کا مطلب کیا ہے؟ یعنی دین کیا ہے اور مذہب کیا ہے؟ دین کسے کہتے ہیں اور مذہب کسے؟

۳۔ قارئین کو معلوم ہے کہ ہم اس حقیقت کو مسلسل پیش کرتے چلے آرہے ہیں کہ قرآن کریم کی نصوص صریحہ کی روشنی میں فرقہ بندی شرک ہے اور عذاب خداوندی کا موجب۔ ہم نے علماء حضرات سے بار بار دریافت کرنے کی جرأت کی کہ ان احکام خداوندی کی روشنی میں اسلام میں فرقہ بندی کی گنجائش کس طرح پیدا ہو سکتی ہے۔ ان حضرات میں سے کسی نے اس کا جواب نہ دیا کیونکہ اس کا جواب دیا ہی نہیں جا سکتا لیکن انہوں نے اب کچھ عرصہ سے فرقہ کی جگہ، مکتب فکر کی اصطلاح استعمال کرنی شروع کر دی ہے اور یوں بظاہر عوام کو لیکن درحقیقت خود اپنے آپ کو یہ فریب دے لیا ہے کہ اس سے ہم پر قرآنی الزام عائد نہیں ہوتا۔

سوال تصفیہ طلب یہ تھا کہ مختلف فرقوں کے باہمی اختلافات کی موجودگی میں، اسلام کی تعلیمات کو عام کرنے کی صورت کیا ہو۔ مفتی صاحب نے اس سلسلے میں فرمایا ہے کہ:۔

> اس دشواری کا معقول، فطری اور قابل عمل حل یہ ہے کہ ریڈیو کے عام پروگرام اُس مکتب فکر کے مطابق ہوں جس کی ملک میں اکثریت ہے۔ ہمارے ملک میں بھاری اکثریت حنفی مسلمانوں کی ہے۔ ان میں جو دو مختلف مکتب فکر دیوبندی اور بریلوی کے نام سے معروف ہیں، ان کے باہمی اختلافات، اسلام کی عملی اور فقہی تعلیمات میں نہیں بلکہ فروعی عقائد میں ہیں۔ ان فروعی عقائد کی حد تک اس بات کی پابندی کی جا سکتی ہے کہ باہمی اختلافی مسائل کو ریڈیو پر اچھالا نہ جائے۔ فقہی معاملات میں چونکہ ان دونوں میں کوئی اختلاف نہیں لہٰذا اسلام کی عملی ہدایات میں کوئی اختلاف پیدا نہیں ہوگا اور انہیں آسانی سے منظر عام پر لایا جا سکتا ہے۔
> اب صرف دو مکتب فکر یعنی اہلحدیث اور شیعہ حضرات باقی رہ جاتے ہیں اگر ضروری ہو تو ان کے لئے خاص اوقات میں الگ پروگرام رکھے جا سکتے ہیں اور یہ کوئی فرقہ وارانہ امتیاز کی بات نہیں بلکہ مشترک مقاصد کو حاصل کرنے کے لئے ایک عمل سبیل ہے۔

یہ ہے اس مشکل کا حل جسے ملک کے یہ ممتاز ترین مفتی صاحب پیش فرما رہے ہیں۔ یہ صاحب بریلوی اور دیوبندی اختلافات کو فروعی قرار دے رہے ہیں اور ان فروعی اختلافات کی شدت کا یہ عالم ہے کہ یہ دونوں "مکاتیب فکر" ایک دوسرے کے خلاف کفر کے فتوے صادر کرتے رہتے ہیں اور ان کی بنا پر ان دونوں فرقوں کے متبعین میں جس قدر باہمی سر پھٹول ہوتا رہتا ہے وہ کسی شہادت کا محتاج نہیں۔

باقی رہے حنفی حضرات اور اہل حدیث، سو ان کے باہمی تعلقات جس قسم کے ہیں اس کے لئے صرف ایک واقعہ پیش کر دینا کافی ہے جو دیوبندی حضرات کے ترجمان ہفتہ وار اخبار "خدام الدین" کی ۱۴ جون ۱۹۶۲ء کی اشاعت میں شائع ہوا ہے اس میں مفتی محمد حسین صاحب بانی مدرسہ جامع اشرفیہ و خلیفہ اعظم، حضرت اقدس حکیم الامت مولانا شاہ اشرف علی تھانوی رح کے کوائف حیات کے سلسلے میں لکھا گیا ہے کہ:

> آپ نے حضرت حکیم الامت، مولانا تھانوی رح نور اللہ سے بیعت کی درخواست کی۔ حضرت نے ارشاد فرمایا کہ چونکہ تم نے احادیث مبارکہ، اہل حدیث صاحبان سے پڑھی ہیں۔ اس لئے کہ میں مسلکاً حنفی ہوں، جوڑا پیدا نہیں ہوگا۔ لہٰذا

آپ پہلے کسی حنفی عالم سے حدیث پڑھیں پھر درخواستِ بیعت کریں۔ یہ ہے احناف اور اہل حدیث کے اختلاف کی کیفیت جنہیں مفتی صاحب، مکاتبِ فکر کہہ کر پکارتے ہیں۔

ہمیں اکثر بتایا جاتا ہے کہ حضور نبی اکرمؐ نے فرمایا تھا کہ میری اُمت میں تہتر فرقے ہوں گے اُن میں بہتر فرقے جہنمی ہوں گے اور ایک فرقہ جنتی۔ کیا مفتی صاحب محترم فرمائیں گے کہ اگر مسلمانوں کے فرقے نہیں، مکاتبِ فکر ہیں تو وہ فرقے کون سے ہیں جن پہ حدیثِ نبوی کا اطلاق ہوتا ہے۔ نیز یہ بھی کہ ان مکاتبِ فکر کی فقہ تک اپنی اپنی ہے۔ یہ ایک دوسرے کے ساتھ مل کر نماز تک نہیں پڑھتے۔ اگر یہ محض نظری اختلاف ہے (جس کی وجہ سے انہیں مکاتبِ فکر کہا جاتا ہے) تو پھر "عملی اختلاف" کیا ہوتا ہے جس سے ایک فرقہ متشکل ہوتا ہے!

آخر میں محترم نے ایک عظیم حقیقت کا اعلان فرمایا۔ وہ مسلمانوں کی ذلت و پستی کا ماتم کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ:-

اگر عزت و خوشحالی اس (قوم) کے مقدر میں ہے تو اس کا راستہ اس کے سوا کوئی اور نہیں کہ اس میں ایک ایسی سرگرم، پُرجوش اور فعال تحریک کو اُبھارا جائے جو ایک مرتبہ جرأت کر کے زندگی کی فرسودہ ڈگر کو بدلنے کا عزم لے کر کھڑی ہو۔ عوام کو نیا حوصلہ، نئی اُمنگ اور نیا ولولہ عطا کرے۔ ذہنی غلامی کے سارے بندھن توڑ کر حقیقت پسندی کے ساتھ اپنے مسائل کا خود جائزہ لے۔ کسی کی اندھی تقلید کی بجائے دنیا میں اپنا راستہ خود بنائے اور عزم و ہمت سے کام لے کر اس پر چل کھڑی ہو۔

چین کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ اُس نے اپنی اجتماعی تباہی کے آخری سرے پر پہنچنے کے بعد یکلخت بیداری کی جو کروٹ لی ہے۔ تو سالہا سال کے رسوم و رواج اور صدیوں کے بنے اور جمے ہوئے نظامِ حیات کو یکسر بدل ڈالا۔ اور اس انقلاب میں کسی خاص قوم یا خاص ملک کی تقلید کرنے کی بجائے، اپنا راستہ آزادی کے ساتھ خود معین کیا اور اُس پر عمل کر کے دکھا دیا۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ ایک مختصر مدت کے بعد آج وہ دنیا کی عظیم طاقتوں سے آنکھیں چار کر رہا ہے۔

اپنی آنکھیں نہ ملئے اور یقین مانیئے کہ یہ مفتی محمد شفیع صاحب ہی کے الفاظ ہیں جنہیں ہم نقل کر رہے ہیں —— اُن مفتی صاحب کے جن کی ساری عمر اُن لوگوں کے خلاف، کفر کے فتوے صادر کرنے میں گذر گئی جنہوں نے "سالہا سال کے رسوم و رواج اور صدیوں کے بنے اور جمے ہوئے نظامِ حیات" کے خلاف ادنیٰ سا قدم بھی اٹھایا اور اسلاف کی "اندھی تقلید کی بجائے دنیا میں اپنا راستہ خود بنانے" کے عزم کا اظہار کیا ہو —— خواہ یہ راستہ قرآن کریم کی روشنی میں ہی کیوں نہ بنانا مقصود ہو۔ لیکن ہمیں خوشی ہے کہ عمر کے اس آخری حصے میں انہیں یہ کچھ کہنے کی توفیق نصیب ہوئی۔ اللہ انہیں اس پر استقامت سے قدم جمائے رکھنے کی سعادت نصیب فرمائے۔

زمانہ کے تقاضے انسان کو کس طرح مار مار کر صحیح راستے کی طرف لے آتے ہیں۔ کاش یہ لوگ قرآن کی روشنی میں صحیح راستوں کی تلاش کرتے تو بہت عرصہ پہلے اور تباہیوں اور خفتوں کے بغیر اس حقیقت تک پہنچ جاتے۔

۴۔ ہماری صحافت کی پستی

پرویز صاحب 'اخبارات میں شاذ ہی لکھتے ہیں۔ ماہ جون ۱۹۷۴ء میں "تحریک احمدیت" کے سلسلے میں ہر زنتے

نئے مسائل اُبھرتے چلے آتے تھے جن کی سا تھ کے ساتھ وضاحت ضروری تھی، اور یہ محسوس ہو رہا تھا کہ اُن مسائل کے متعلق اطمینان بخش طریق سے اخبارات میں کچھ نہیں آ رہا۔ (طلوعِ اسلام کا پرچہ، شروع جولائی میں شائع ہوتا تھا۔ پرویز صاحب عقیدہ ختمِ نبوّت کو جس قدر اہمیت دیتے ہیں وہ ظاہر ہے۔ وقت کے ان اہم اور نازک تقاضوں کے پیشِ نظر انہوں نے چھوٹے چھوٹے مقالات، اخبارات میں اشاعت کے لئے بھیجے۔ اِن اخبارات نے انہیں قبول تو بڑی خندہ پیشانی سے کیا لیکن چھاپا نہیں۔ بعض نے چھاپا تو اُن کا مثلہ کر کے لیکن اِن سب میں پست ترین، ذہنیت کا ثبوت اخبار مشرق (لاہور) نے پیش کیا۔ جو مقالہ انہیں بھیجا گیا۔ اُس کا عنوان تھا "احمدیوں کے سیاسی عزائم" اور اس کی پیشانی پر لکھا گیا تھا" پرویز صاحب کی زیرِ طباعت کتاب ختمِ نبوّت سے مقتبس"۔ اِس اخبار نے اِس مقالہ کو ۲۸ رجون ۱۹۷۷ء کے ربلی ایڈیشن کے صفحہ اوّل پر نہایت نمایاں حیثیت سے رنگین چھاپا لیکن اِس حیثیت سے کہ اس کے عنوان کو یوں تبدیل کر دیا۔ مرزا غلام احمد قادیانی اپنی تحریروں کے آئینے میں ـــ اور مقالہ کے آخر میں لکھا (کتاب "ختمِ نبوّت" سے اقتباس) یعنی نہ مقالہ نگار کا نام پیشانی پر دیا اور نہ ہی کتاب "ختمِ نبوّت" کے مصنّف کی حیثیت سے ان کا نام چھاپا گیا۔ یعنی مقالہ تو ایسی نمایاں حیثیت سے شائع کیا لیکن احتیاط یہ برتی کہ صاحبِ مقالہ کا نام یا ذکر کہیں آنے نہ پائے!

یہ ہے وہ سطح جس پر بدقسمتی سے ہماری صحافت اترآئی ہے ـــ اور اس کے بعد انہیں شکایت ہوتی ہے کہ لوگوں کے دل میں ان کا احترام نہیں رہا۔

جن اخبارات نے ان مقالات کو صحیح طور پر شائع کیا ان کی ہمارے دل میں بھی قدر ہے اور ہمیں امید ہے کہ ان کے قارئین کے دل میں بھی ان کی قدر و عزّت ہو گی۔

۵۔ سورۂ یُوسف کے سلسلے میں احتیاط کی ضرورت

آج کل پرویز صاحب کے ہفتہ واری درسِ قرآنِ کریم میں سُورۂ یوسف وجہِ تابانیٔ قلب و نگاہ ہو رہی ہے۔ اور سیرتِ یوسفی کی ایسی رعنائیاں سامنے آ رہی ہیں جن سے بصیرت میں جلا پیدا ہو جاتی ہے۔ کردارِ یوسفی کی بلندی اور پاکیزگی، قرآنِ کریم کا معجزانہ بیان اور پرویز صاحب کی حقیقت کشا تشریحات ـــ ان کے حسین امتزاج سے فضا جگمگا اٹھتی ہے۔

اسی دوران میں، درس کے سامعین میں سے ایک صاحب نے تصور سے شائع ہونے والے ماہنامہ افکار صوفیا کی نومبر ۱۹۷۱ء کی اشاعت کا پرچہ لا کر دکھایا۔ اس میں شائع شدہ ایک مقالہ کا عنوان ہے ـــ چند قابلِ توجہ مسائل جن سے نہ صرف عوام بلکہ بعض علماء تک غافل ہیں ـــ مقالہ کی پیشانی پر" اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی" کے الفاظ ثبت ہیں۔ اُن مسائل میں ایک مسئلہ یہ بھی ہے کہ:

"حدیث صحیح سے ثابت ہے کہ لڑکیوں کو سورۂ یوسف شریف کا ترجمہ نہ پڑھایا جائے کہ اس میں مکر زنا کا ذکر فرمایا۔"

ذرا اس مبینہ "حدیث" کے مضمون پر غور کیجئے جسے صحیح کہا گیا ہے۔ اوّل تو حضورؐ کے زمانے میں قرآن شریف کے ترجمہ کا خیال تک بھی پیدا نہیں ہوا ہوگا۔ دوسرے یہ کہ رسول اللہؐ جس ملک میں مبعوث ہوئے اور جو قوم آپؐ کی اوّلین مخاطب تھی۔ ان کی زبان عربی تھی جس میں قرآنِ کریم نازل ہوا تھا اور وہاں کے مرد اور عورتیں، سب اسی قرآنِ کریم کی تلاوت کرتے تھے۔ "اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی" کی بیان فرمودہ "صحیح حدیث" کی روشنی میں یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ عرب عورتوں اور لڑکیوں کو اس (معاذ اللہ) خرابی سے محفوظ رکھنے کی کیا تدبیر کی گئی ہوگی جس کے سورۃ یوسف کے ترجمے سے پیدا ہونے کا امکان تھا؟

راہنی مسائل میں ایک مسئلہ یہ بھی ہے کہ:

> عورتوں کو لکھنا سکھانا شرعاً ممنوع و سنتِ نصاریٰ، باب ہزاراں فتنہ اور مستان سرشار کے ہاتھ میں تلوار دینا ہے۔۔۔۔۔ متعدد حدیثیں اس کی ممانعت میں وارد ہیں۔

یہ ہے وہ تعلیم جو حضور نبی اکرمؐ کی طرف منسوب کرکے قوم کو دی جا رہی ہے اور اس قسم کی ہیں وہ حدیثیں جن کے انکار سے ہمارے علمائے کرام کے نزدیک کفر لازم آجاتا ہے۔

محترم پرویز صاحب کا درسِ قرآن کریم

لاہور میں	لائلپور میں	ملتان میں
ہر اتوار۔ صبح ۸ بجے بمقام ۲۵/بی گلبرگ ۲ لاہور ٹیلیفون ۸۰۸۰	بروز جمعہ (بذریعہ ٹیپ) ۵ ½ بجے سہ پہر بمقام: دفتر بزمِ طلوعِ اسلام ۲۵ کوتوالی روڈ متصل حیات سرجری کلینک لائلپور رابطہ کیلئے ٹیلیفون نمبر ۲۴۹۴۲	بروز جمعہ (بذریعہ ٹیپ) بعد از مغرب بمقام دفتر شاہ سنز بیرون پاک گیٹ ملتان ٹیلیفون نمبر ۲۰۷۱

سیالکوٹ میں	کراچی میں
ہر اتوار صبح ۸ بجے (بذریعہ ٹیپ) مکان نمبر ۸۹۴ چوہدری محمد دین ملک کمال دین ناظم طلوعِ اسلام موضع فاکا نز گوہر پور (محلہ مغربی) سیالکوٹ	ہر اتوار۔ صبح ۹ ½ بجے (بذریعہ ٹیپ) بمقام: دفتر طلوعِ اسلام۔ دار العقائد ۲۰/۱-B بس سٹاپ ۴ - ناظم آباد III کراچی ۱۸ ٹیلیفون نمبر ۶۱۰۴۶۸

کوئٹہ میں	راولپنڈی میں	واہ میں
ہر اتوار۔ ۳ ½ بجے بعد دوپہر (بذریعہ ٹیپ) بمقام: ۳ گوردت سنگھ روڈ فون نمبر ۷۰۰۰ کوئٹہ	ہر جمعہ ۵ بجے سہ پہر (بذریعہ ٹیپ) بمقام: جی ۱۶۶ - لیاقت روڈ راولپنڈی	ہر جمعہ - بعد نماز جمعہ (بذریعہ ٹیپ) بمقام: ۱۵-۱۰ جہلم روڈ واہ (WAH)

پروفیسر رفیع اللہ شہاب

خاندانی منصوبہ بندی حقیقت پسندی کی ضرورت

کثرتِ آبادی کا مسئلہ جس طرح دن بدن سنگین صورت اختیار کرتا جا رہا ہے اس نے ایٹمی ہتھیاروں کے خطرات کو بھی اپنے پیچھے چھوڑ دیا ہے۔ آج شاذ ہی دنیا کا کوئی ایسا ملک ہو جو اس مسئلہ سے دوچار نہ ہو۔ اسی لئے تو عالمی سطح پر خاندانی منصوبہ بندی کے پروگرام مرتب کئے جا رہے ہیں۔ ہمارے ملک میں غیر سرکاری سطح پر اس کا چرچا تو کئی سال پہلے ہو چکا تھا لیکن باقاعدہ سرکاری طور پر اس سکیم پر عمل کوئی دس سال ہوئے شروع کیا گیا تھا۔ اس وقت اس اسکیم کے جو مقاصد پیش کئے گئے تھے وہ یہ تھے کہ ہماری آبادی میں تقریباً پچاس فی ہزار کی شرح سے اضافہ ہو رہا ہے اسے کم کر کے چالیس یا پینتیس فی ہزار تک لایا جائے گا۔[1] خیال رہے کہ یہ پچاس فی ہزار کا اضافہ مشرقی پاکستان کی وجہ سے تھا کہ وہاں مغربی پاکستان کی نسبت آبادی زیادہ تیزی سے بڑھ رہی تھی۔ اگر اس حقیقت کو سامنے رکھا جائے تو ہمارے ملک میں خاندانی منصوبہ بندی کا پروگرام شروع کرتے وقت مغربی پاکستان میں آبادی کا اضافہ چالیس فی ہزار سے کسی طور زیادہ نہ تھا۔

چنانچہ اس اسکیم پر بڑے زور شور سے عمل شروع کیا گیا اور اس پر کروڑوں روپے کی غیر ملکی امداد کے علاوہ ملکی وسائل سے بھی اتنی ہی رقم خرچ کی گئی۔ ان اخراجات کا اندازہ اس سے لگایئے کہ اس سال کے مالی بجٹ میں اس اسکیم پر صرف ملکی وسائل سے ساڑھے چودہ کروڑ روپے خرچ کئے جائیں گے۔ اب دیکھئے کہ آٹھ سال کی کوششوں اور کروڑوں روپے کے اخراجات برداشت کرنے کے بعد اس اسکیم کے کیا نتائج برآمد ہوئے۔ بہتر ہوگا کہ اسے بھی سرکاری ترجمان کی زبانی پیش کیا جائے۔ ملاحظہ فرمایئے:-

"پاکستان میں ۱۹۶۵ء کے آخر تک شرح پیدائش بینتالیس فی ہزار سے کم کر کے چالیس فی ہزار کرنے کے لئے خاندانی منصوبہ بندی کا ایک توسیع شدہ پروگرام شروع کیا گیا ہے۔ پروگرام کا قطعی مقصد ۱۹۸۵ء تک شرح پیدائش کم کر کے ۵ء۱ فیصد تک لانا ہے۔ پروگرام کے لئے رواں مالی سال کے بجٹ میں دس کروڑ پچیس لاکھ روپے مختص کئے گئے ہیں۔ ۱۹۶۱ء کی مردم شماری کے مطابق پاکستان کی آبادی اب تقریباً ساڑھے چھ کروڑ ہو گئی ہے۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ۱۹۶۱ء کو ختم ہونے والے عشرے کے دوران آبادی میں ۶۳۳ء ۵ فی ہزار کا اضافہ ہوا ہے۔"

(روزنامہ نوائے وقت مورخہ ۲۰ مارچ ۱۹۶۸ء آخری صفحہ)

۱۹۶۱ء کی مردم شماری کے یہ اعداد و شمار آج سے ڈیڑھ سال پہلے شائع ہوئے تھے اور خاندانی منصوبہ بندی کا محکمہ

---

[1] روزنامہ مشرق لاہور بابت یکم جولائی ۱۹۶۵ء اشاعت خاص تیسرا پنجسالہ منصوبہ صفحہ ۸ کالم نمبر ۵

اِس فرق کی مناسب توجیہ پیش نہ کر سکا کہ آبادی میں چالیس پینتالیس فی ہزار اضافے کی شرح گھٹنے کی بجائے اکاون فی ہزار سے بھی زیادہ کیوں ہو گئی ہے۔ تاہم اِس ناکامی سے انہیں یہ احساس ضرور ہوا کہ ملک میں جس طبقے کو خاندانی منصوبہ بندی کی سخت ضرورت ہے وہ اِس پر عمل نہیں کر رہا۔ یہ طبقہ کسانوں اور مزدوروں کا ہے جو ملک کی نوّے فیصد آبادی پر مشتمل ہے۔ چنانچہ اس بارے میں یہ فیصلہ کیا گیا کہ اِس بارے میں اِس طبقہ کے خیالات اور ردِّ عمل کو معلوم کیا جائے۔ ۱۹۷۴ء آبادی کا عالمی سال قرار دیا جا چکا ہے اور اس مسئلہ کی اہمیت کو اجاگر کرنے کے لئے تمام ممالک میں مجالسِ مذاکرہ منعقد ہو رہی ہیں۔ ہمارے ملک میں ایسی مجلس مذکورہ پچھلے سال ستمبر کے آخری ہفتہ میں لاہور میں منعقد ہوئی۔ چنانچہ مذکورہ بالا فیصلے کے مطابق اِس مذاکرہ میں ملک بھر کے کسانوں اور مزدوروں کے نمائندوں کو اپنے خیالات اور تجاویز پیش کرنے کی دعوت دی گئی۔ راقم چونکہ ملک میں خاندانی منصوبہ بندی کے پروگرام کے شروع ہونے سے بھی پہلے سے اسے ایک خالص انسانی مسئلہ سمجھتے ہوئے اس میں دلچسپی لیتا رہا ہے اور اب تک اس مسئلے کے شرعی جواز کے بارے میں کوئی ایک درجن کتابیں اور کتابچے تالیف کر چکا ہے۔ اس لئے اُسے بھی اِس مجلسِ مذاکرہ میں شرکت کی دعوت دی گئی۔

اِس مجلسِ مذاکرہ کی اہمیت کا اندازہ اس سے لگایئے کہ اِس کا افتتاح صدر پاکستان جناب چودھری فضل الٰہی صاحب نے فرمایا۔ آپ نے اپنے افتتاحی خطبے میں یہ اعلان کیا تھا کہ حکومت اس مجلسِ مذاکرہ کی سفارشات کو ہر ممکن طریقے سے عملی جامہ پہنانے کی کوشش کرے گی۔ اس مذاکرے میں کسانوں اور مزدوروں نے دل کھول کر کامل آزادی سے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ اور اس مسئلہ میں ان کی دلچسپی کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ مذاکرے کے اِس دن نیپلکے ہال میں تل دھرنے کو جگہ نہیں تھی۔ اس مذاکرے کے بارے میں اپنی طرف سے کچھ کہنے کی بجائے ہم پہلے اُسے درج کرتے ہیں جو سرکاری طور پر بیان کیا گیا ہے۔

"مزدور اور کسان فورم نے یہ رائے بھی ظاہر کی کہ خاندانی منصوبہ بندی کے بارے میں عوام کے خیالات بالعموم بڑے غلط سلط ہیں۔ پاپولیشن پلاننگ پروگرام کی تشہیری مہم کا الٹا اثر ہوا ہے۔ نعرے اور اشتہاری بینرز پروگرام کے لئے سُود مند ثابت نہیں ہوئے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ پبلسٹی کے بجائے عملی تدابیر اپنائی اور معلومات اور خدمات مہیا کی جائیں۔ فورم نے خواہش ظاہر کی کہ پاپولیشن پلاننگ کا مطمحِ نظر یہ ہونا چاہیئے کہ موجودہ آبادی کے سماجی اور معاشی حالات سدھارے جائیں۔ اسے یہ بھی طے کرنا چاہیئے کہ مستقبل میں ترقیاتی کام کے لئے کس قدر توسیع کی ضرورت ہے۔"

(ماہنامہ "سکھی گھر" بابت ستمبر اکتوبر نومبر ۷۳ء صفحہ ۳۰)

ترجمان نے معلوم نہیں رکن مصالح کی بنا پر فورم کی بحث کا اہم ترین نکتہ چھوڑ دیا۔ وہ نکتہ یہ تھا کہ مزدوروں اور کسانوں نے خاندانی منصوبہ بندی کی موجودہ تشہیری مہم کے الٹے اثر کی وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ چونکہ ہمارے علماء اسے شرعی طور پر ناجائز قرار دیتے ہیں اس لئے ان کی طرف سے بار بار اس کی حرمت کے احساس دلانے سے ہم لوگ خاندانی منصوبہ بندی کی ترغیب دینے والے اشتہاروں اور نعروں سے چڑ جاتے ہیں۔ ایک موقعہ پر تو اس بحث میں تھوڑی سی تلخی بھی پیدا ہو گئی تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ مذاکرے کا انتظام جمعہ کے دن کیا گیا تھا اور کسانوں اور مزدوروں کے اکثر نمائندے قریبی مسجد میں نمازِ جمعہ ادا کرنے گئے تھے وہاں مولوی صاحب نے خاندانی منصوبہ بندی کی خوب خوب خبر لی۔ جس کی وجہ سے یہ

نمائندے خاصے متاثر ہو گئے تھے۔

اہم مسائل پر مجالس مذاکرہ منعقد کرانے کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ اس میں ہونے والے بحث مباحثے کی روشنی میں خامیوں کو دور کر کے صحیح منزل کا تعین کیا جائے۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ملک میں خاندانی منصوبہ بندی کے اصل ضرورت مند طبقے کے خیالات سُننے کے باوجود ان کی خواہشات کا خیال نہیں کیا جا رہا ہے اور پہلے کی طرح صرف انہیں تشہیری ذرائع سے کام لیا رہا ہے جن کے بارے میں انہوں نے اپنے منفی ردِ عمل کا اظہار کیا تھا۔

پاکستان ایک اسلامی ملک ہے اور یہ امر فطری ہے کہ یہاں کے باشندے چاہے وہ مزدور ہوں یا کسان یا کچھ اور ایسے مسائل کی شرعی حیثیت کو ضرور سامنے رکھیں گے۔ شرعی لحاظ سے خاندانی منصوبہ بندی میں کوئی قباحت نہیں اور راقم اس کے شرعی جواز کی تفصیلات کو کوئی ایک درجن کتابوں اور کتابچوں میں پیش کر چکا ہے۔ لیکن اس پروگرام کے کرتا دھرتا اس مسئلہ کی شرعی حیثیت کے سلسلے میں کچھ ایسے گھبرا جاتے ہیں کہ مخالفین کو حکومت پر کیچڑ اچھالنے کا موقع مل جاتا ہے۔ صدر ایوب مرحوم کے خلاف بھی یہ حربہ بڑے وسیع پیمانے پر استعمال کیا گیا اور اب بھی وہی کچھ کیا جا رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہماری آبادی کی شرح گھٹنے کی بجائے بڑھتی جا رہی ہے آج سے چند سال پہلے اس کی مخالفت میں ایک کتاب پر جب پابندی لگائی گئی تو راقم نے تجویز پیش کی تھی کہ اس پابندی کی بجائے اگر اسکی شرعی حیثیت پر عام بحث مباحثہ کی حوصلہ افزائی کی جائے تو اس کا جواز واضح ہو کر سامنے آجائے گا اور مخالفت خود بخود ختم ہو جائے گی۔ اس بارے میں دراصل میرے سامنے مصر کی مثال تھی جو ہماری طرح اس مسئلہ سے دوچار ہے۔ وہاں یہ اسکیم ہم سے بھی پہلے شروع کی گئی تھی۔ وہاں اس پروگرام کو پیش کرنے والوں نے اس مسئلہ کی شرعی حیثیت سے گھبرانے کی بجائے اس پر عام بحث مباحثہ کی حوصلہ افزائی کی اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہاں کی خاندانی منصوبہ بندی کونسل کا افتتاح حکومت کے ایک مخالف عالمِ دین نے کیا۔ یہ عالم دین جناب حسن البنا شہید تھے جو اُس وقت وہاں کی مشہور اسلامی جماعت الاخوان المسلمون کے صدر تھے

اِن تفصیلات کی روشنی میں ہم ایک دفعہ پھر عرض کریں گے کہ اگر حکومت اس اسکیم کے خاطر خواہ نتائج حاصل کرنا چاہتی ہے تو حقیقت پسندی سے کام لیا جائے اور اسکی ترغیب کے لئے پبلسٹی کے ان طریقوں کو اختیار کیا جائے جن کا اصل ضرورت مند طبقے پر مناسب اثر پڑے اور ان طریقوں کو ترک کر دیا جائے۔ جن سے وہ خواہ مخواہ چڑ جاتے ہیں دوسرے عام بحث مباحثے کے ذریعے ان کی سب سے بڑی رکاوٹ کہ شریعت اسلامی اسے ناجائز قرار دیتی ہے، دُور کی جائے ہمارے پیش کردہ طریقے کے مطابق یہ رکاوٹ بڑی آسانی سے دور ہو جائے گی۔ اس رکاوٹ کے دور ہونے کا ایک دوسرا اہم فائدہ یہ ہو گا کہ حکومت کے مخالفین کے ہاتھ سے وہ حربہ بھی چھن جائے گا جس کے ذریعے وہ وقتاً فوقتاً ہر حکومت کو مطعون کرتے رہتے ہیں۔

کراچی میں ادارہ طلوعِ اسلام کی مطبوعات حاصل کرنے کے لئے
دفتر بزمِ طلوعِ اسلام کراچی سے رابطہ قائم کریں۔
پتہ: القائد ۲۰/بی۔ ناظم آباد نمبر ۳ (بس سٹاپ ۷) کراچی ۱۸ فون نمبر ۶۱۰۴۶۸

مُعاملہ کی ضروری باتیں

۱۔ قارئین کو اگر پرچہ نہیں ملتا تو اُن میں سے بعض احباب اس طرح غضب آلود خط لکھتے ہیں، گویا ہم کسی سنگین جرم کے مرتکب ہوئے ہیں۔ پرچہ کی ترسیل کا قاعدہ یہ ہے کہ اُن پتوں کے مطابق جو قارئین نے ہم پہنچائے ہوئے ہیں، لفافے تیار کرنے کے بعد بڑی احتیاط سے چیک کئے جاتے ہیں اور پھر اُنہیں ایک ہی قسط میں مہینے کی آخری تاریخ کو یا اگلے مہینے کی ۲ تاریخ کو مقامی ڈاکخانہ کے سپرد کر دیا جاتا ہے۔ اس کے بعد ہم کچھ نہیں کر سکتے۔ یہ محکمہ ڈاک کی ذمہ داری ہوتی ہے کہ وہ ہر پرچہ متعلقہ پتہ پر پہنچا دے۔ اس سے آپ نے دیکھ لیا ہوگا کہ اگر کوئی پرچہ خریدار تک نہیں پہنچتا تو اس کے لئے ہم ذمہ دار نہیں ہوتے۔ قارئین سے درخواست ہے کہ وہ پرچہ نہ ملنے کی صورت میں ہمیں صرف دو سطریں بطور اطلاع لکھ بھیجا کریں۔ خواہ مخواہ غصے میں آ کر اپنا خون نہ کھولایا کریں۔

۲۔ بعض قارئین کی طرف سے خطوط موصول ہو جاتے ہیں کہ ہمیں چار مہینے سے پرچہ نہیں ملا۔ ہم بار بار اعلان کرتے رہتے ہیں کہ پرچہ نہ ملنے کی اطلاع اُس مہینے کی ۱۵ تاریخ تک بھیج دینی چاہیئے۔ اُس کے بعد ہو سکتا ہے کہ فالتو پرچہ ہمارے پاس ہو ہی نہ۔ اگر یہ اطلاع پندرہ تاریخ کے بعد ملے تو پرچہ موجود ہونے کی صورت میں بھیج دیا جائے گا، ورنہ ہمیں معذور سمجھا جائے۔

۳۔ اکثر حضرات خطوط میں اپنا پورا نام لکھنے کی بجائے محض دستخط کر دیتے ہیں۔ آپ سوچیئے کہ اس قسم کے دستخطوں سے ہمارے لئے یہ معلوم کرنا کس قدر مشکل ہے کہ مکتوب نگار کون صاحب ہیں۔ اپنا نام صاف صاف لکھا کریں۔

۴۔ منی آرڈر کے کوپن پر تو اکثر احباب نہ اپنا نام لکھتے ہیں، نہ پتہ۔ منی آرڈر کا فارم ڈاکخانہ واپس چلا جاتا ہے اور ہمارے پاس کوئی ریکارڈ نہیں رہتا کہ فرستندہ کون تھا۔ منی آرڈر کے کوپن پر اپنا نام اور پتہ صاف صاف لکھا کریں اور بالالتزام۔

۵۔ چندہ آپ بذریعہ منی آرڈر بھیجیں یا بذریعہ وی پی۔ چندہ موصول ہونے پر ایک اطلاعی کارڈ بطور رسید بالالتزام بھیجا جاتا ہے۔ اگر آپکو ایسا کارڈ نہ ملے تو ہمیں فوری اطلاع دیں۔ ہو سکتا ہے کہ آپ کا منی آرڈر یا وی۔پی ہم تک پہنچا نہ ہو۔

۶۔ آپ خط و کتابت میں یا منی آرڈر وغیرہ پر جہاں اپنا نام لکھیں، اُس کے ساتھ اپنا خریداری نمبر ضرور تحریر کریں یہ خریداری نمبر اُس پتہ کی چیٹ پر لکھا ہوتا ہے جو پرچہ کے لفافے کے اوپر چسپاں کی جاتی ہے۔ اُس نمبر کو اپنی ڈائری میں مستقل طور پر نوٹ کر رکھیں۔

۷۔ پیشگی خریداری سے مراد یہ ہے اگر آپ ایک سو روپیہ یکمشت یا بالاقساط جمع کرا دیں تو ادارہ

(بقیہ مقابل کے صفحہ پر)

خدا پر ایمان

مذہب کی بنیاد ہے۔ اس لئے (ماسوائے دہریوں کے) ہر شخص کسی نہ کسی شکل میں خدا کو ضرور مانتا ہے۔

- لیکن ہر شخص کا خدا کا تصوّر الگ الگ ہوتا ہے حتیٰ کہ مختلف مذاہب میں بھی خدا کا تصوّر مختلف ہے۔
- قرآن مجید نے خدا کا تصوّر بڑی شرح و بسط سے دیا ہے اور وہ خدا کے ماننے والوں سے بھی خدا پر ایمان لانے کا مطالبہ کرتا ہے۔
- قرآن مجید نے خدا کا تصوّر کس قسم کا دیا ہے، اور خدا اور بندے کا تعلق کیا ہے، یہ سوال بڑا اہم ہے۔
- اس سوال کا جواب، مفکرِ قرآن پرویز صاحب نے اپنی سب سے پہلی تصنیف

"من و یزداں"

میں بڑی تفصیل سے دیا ہے۔

- یہ کتاب بڑی مقبول ہوئی لیکن کچھ عرصہ سے نایاب تھی۔
- اس گرانی کے زمانے میں ایسی ضخیم اور دقیع کتابوں کا شائع کرنا، اور وہ بھی ادارہ طلوعِ اسلام کے روایتی معیار کے مطابق، ہمت طلب مرحلہ ہے۔
- لیکن ادارہ نے کسی نہ کسی طرح یہ مرحلہ طے کر لیا، اور اب یہ کتاب، مصنف کی نظرِ ثانی کے بعد چھپ کر آ گئی ہے۔
- بڑا سائز، ضخامت چار سو صفحات سے زائد۔ وہائٹ پرنٹنگ پیپر۔ پائدار جلد۔ نظر نواز گرد پوش

قیمت -/۲۵ روپے۔ محصول ڈاک -/۲ روپے۔

ملنے کا پتہ

(۱) ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵-بی گلبرگ ۲ لاہور (۲) مکتبہ دین و دانش، اُردو چوک لاہور

کی طرف سے شائع کردہ جو کتاب بھی آپ منگوانا چاہیں، وہ آپ کو بھیج دی جائے گی۔ ڈاک کا خرچ ہم برداشت کریں گے۔ اور آپ کے حساب میں کتاب کی قیمت، درج کر دی جائے گی۔ اگر ادارہ کوئی نئی کتاب شائع کرے اور وہ آپ کو مطلوب نہ ہو تو اس کی بابت آپ ادارہ کو مطلع فرما دیا کریں۔ نئی کتابوں کی اشاعت کا اعلان طلوعِ اسلام میں شائع ہوتا رہتا ہے۔

ناظم ادارہ طلوعِ اسلام

مجلسِ مذاکرہ

(قسط ۴)

(طلوعِ اسلام کنونشن نومبر ۱۹۷۳ء)

(۱۰)

شوکت پرویز

محترم صدر صاحب اور بزرگانِ کرام

سلامِ رحمت! اس میں کوئی شبہ نہیں کہ آج ہمارا معاشرہ بری طرح سے مایوسی کا شکار ہو رہا ہے۔ نہایت ضروری ہے کہ اس تاریکی سے نکالا جائے کیونکہ اگر مایوسی دور نہ ہو تو اس کا انجام موت ہوتا ہے لیکن مایوسی کو دور کرنے کی تدابیر سوچنے سے پہلے ضروری ہے کہ یہ دیکھا جائے کہ اس مایوسی کی وجہ کیا ہے۔ آیئے دیکھیں کہ ہم مایوس کب ہوتے ہیں۔

ہم ہر صبح چولہے پر پانی چڑھا کر چائے کے برتن تیار کرنے لگ جاتے ہیں۔ یہ اس لئے کہ ہمیں یقین ہے کہ دس منٹ میں پانی کھول جائے گا اور چائے تیار ہو جائے گی۔ پانی فی الواقعہ وقت پر کھولنے لگ جاتا ہے اور چائے تیار ہو جاتی ہے۔ ہم ہر روز ایسا ہی کرتے ہیں۔ اس میں ہمیں کبھی مایوسی نہیں ہوتی لیکن جس دن ایسا ہو کہ چائے تو تیار ہو جائے لیکن دودھ والا مقررہ وقت پر نہ آئے تو سب کیا کرایا دھرے کا دھرا رہ جاتا ہے۔ ہمیں چائے کی طرف سے مایوس ہونا پڑتا ہے۔ میں نے اس تشخیص کی ابتدا ایک مثال سے کی ہے۔ لیکن آپ غور سے دیکھیں گے تو یہ حقیقت سامنے آ جائے گی کہ ہماری ساری زندگی اسی انداز سے گزر رہی ہے۔ صبح اخبار والے کا انتظار ہوتا ہے اس کا کوئی وقت مقرر نہیں کبھی وہ صبح پانچ بجے اخبار پھینک جاتا ہے اور کبھی سات بجے تک بھی اپنی شکل نہیں دکھاتا۔ ناشتہ کا وقت آتا ہے تو دودھ والا غائب ہوتا ہے۔ بھاگم بھاگ بس اسٹینڈ پر پہنچے تو جس بس کو نو بجے آنا تھا۔ ساڑھے نو بجے تک اس کا کہیں نام و نشان تک دکھائی نہیں دیتا۔ کیسی نہ کسی طرح دفتر پہنچتے ہیں تو جن صاحب سے کام تھا۔ وہ گیارہ بجے تک دفتر نہیں آتے۔ آتے ہیں تو انہیں متعلقہ فائل نہیں ملتی۔ خدا خدا کر کے فائل تیار ہوتا ہے تو صاحب بہادر دفتر سے غائب ہوتے ہیں اور کسی کو معلوم نہیں کہ وہ کہاں تشریف لے گئے ہیں اور کب واپس آئیں گے۔ سارا دن انتظار کرتے کرتے۔

شام کو ناکام واپس لوٹتے ہیں تو خیال آتا ہے کہ صبح بچے کو بیمار چھوڑ آئے تھے ڈاکٹر صاحب سے دوائی لیتے جائیں۔ کلینک میں جاتے ہیں تو وہاں مریضوں کی بھیڑ نظر آتی ہے لیکن ڈاکٹر صاحب ندارد کسی کو معلوم نہیں کہ وہ آئیں گے یا نہیں وہ آئیں گے تو کب آئیں گے۔ خدا خدا کر کے ڈاکٹر صاحب تشریف لائے نسخہ لکھوایا۔ دوائی کی تلاش شروع ہوگئی تو وہ ملتی نہیں۔ واپس ڈاکٹر صاحب کے کلینک گئے تو وہ جا چکے تھے۔ تھکے ماندے شام کو گھر آئے تو معلوم ہوا ملازم چار بجے سے سودا لینے گیا ہوا تھا ابھی تک واپس نہیں آیا۔ ڈاک دیکھی تو اس میں بھائی صاحب کا خط تھا کہ وہ اسی شب نو بجے والی ٹرین سے پہنچ رہے ہیں انہیں اسٹیشن سے لے آئیے۔ وقت بہت کم تھا۔ دوڑتے دوڑتے ٹیکسی سٹینڈ پر گئے تو وہاں پر ٹیکسی کوئی نہیں تھی سخت پریشانی ہوئی۔ خدا خدا کر کے ایک ٹیکسی آئی۔ چلنے کو کہا تو جواب ملا میرا میٹر خراب ہے۔ کہا کہ میٹر کے حساب سے نہیں تو جو کچھ قاعدے سے بنتا ہے لے لیجئے۔ عام طور پر ہمارے گھر سے ریلوے اسٹیشن تک قریب دو روپے بنا کرتے ہیں۔ کہنے لگا کہ چار روپے لوں گا۔ بہتیرا سمجھا کر یہاں سے اسٹیشن

کا فاصلہ اتنا نہیں ہے اور اس کے دو روپے سے زیادہ کسی صورت میں نہیں ہو سکتے لیکن اس نے بغیر جواب دیئے ٹیکسی سٹارٹ کرلی اور شروع کر دی۔ مرتا کیا نہ کرتا اسے چار روپے دینے پڑے اور اسٹیشن پہنچ گئے گاڑی نے نو بجے پہنچنا تھا۔ نو کے ساڑھے نو، پھر دس۔ ساڑھے دس، گیارہ، ٹرین کا کچھ پتہ نہیں۔ انکوائری آفس سے پوچھا تو جواب ملا کہ ہمیں ابھی تک پیچھے سے کوئی اطلاع نہیں ملی۔ بارہ بجے کے قریب گاڑی پہنچی۔ باہر نکلے تو پھر وہی ٹیکسی والوں سے جھگڑا۔

بھائی صاحب کو دوسری صبح کچہری میں کچھ کام تھا۔ میں بھی ان کے ساتھ ہو لیا جس وکیل کو فیس دے رکھی تھی۔ معلوم ہوا کہ وہ کسی اور مقدمے کی پیروی کے لئے سیالکوٹ چلے گئے ہیں۔ منشی نے کہا کہ ایک درخواست دی جائے گی جس پر ایک روپے کا ٹکٹ لگے گا۔ بھاگ کر نیچے آئے اسٹامپ فروش کے پاس پہنچے تو جواب ملا کہ ٹکٹ تو چھپ کر ہی نہیں آتے۔ حیران کہ اب کیا کریں۔ منشی صاحب نے کہا کہ اسے پانچ روپے دیجئے ٹکٹ مل جائے گا۔

ایک روپے کا ٹکٹ چھ روپے میں حاصل کر کے درخواست تیار کروائی تو منشی صاحب نے کہا کہ جب تک اہلِ کار کی تواضع نہ کی جائے گی وہ درخواست کو پیش نہیں کرے گا۔ اس کی تواضع کی گئی تو معلوم ہوا کہ جج صاحب چیمبر میں بیٹھے دوستوں کے ساتھ گپیں ہانک رہے ہیں۔ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ کب کمرۂ عدالت میں تشریف لائیں گے۔ باہر برآمدے میں کھڑے انتظار کرنے لگے تو چپڑاسی نے کہا کہ شور نہ مچایئے باہر نکل جایئے۔ باہر میدان میں نہ بیٹھنے کو جگہ تھی نہ سائے کے لئے کوئی چھت۔ دھوپ میں کھڑے سوکھتے رہے حتیٰ کہ عدالت کا وقت ختم ہو گیا۔

میں نے جو کچھ کہا ہے یہ کوئی افسانہ نہیں یہ وہ واقعات ہیں جو ہم میں سے سب کو پیش آتے ہیں اور ہر روز پیش آتے ہیں گھر میں، بازار میں، دفتر میں، عدالت میں، ہسپتال میں غرضیکہ کوئی ایسا مقام نہیں جہاں ہر بات اپنے وقت پر ہو جائے یا کسی معاملہ کا فیصلہ انصاف اور قانون کے مطابق طے پا جائے ہمارے معاشرہ میں غیر ذمہ داری اور لاقانونیت عام ہو رہی ہے۔ اور یہی اس عالمگیر مایوسی کا حقیقی سبب ہے۔ ایسے حالات میں دو ہی صورتیں ہوتی ہیں یا تو انسان ہار تھک کر وہی کچھ کرنے لگ جاتا ہے جو دوسرے کرتے ہیں۔ یا مایوس ہو کر معاشرہ کو کوسنے اور اس طرح اپنے دل کا غبار نکالنے میں مصروف ہو جاتا ہے یہ ہے جو کچھ ہمارے ساتھ ہو رہا ہے۔ اس مرض کا علاج کہیں باہر سے نہیں ہو گا۔ یہ تو ہمارے کرنے سے ہی ہو گا۔ اگر ہم میں سے ہر فرد وقت کی پابندی اور ایفائے عہد کا پابند ہو جائے تو مایوسی کے نوے فی صد اسباب کا خاتمہ ہو سکتا ہے باقی دس فی صد کا تعلق اس سے ہے کہ یہاں انصاف خریدنا پڑتا ہے تو اس کے لئے ایسے ارباب کردار کی ضرورت ہو گی جو نقصان اٹھائیں لیکن قیمت ادا کر کے انصاف نہ خریدیں۔ اگر معاشرہ کے چند افراد بھی اس کا تہیہ کر لیں تو آپ دیکھیں گے کہ ہوا کا رُخ کس طرح بدل جاتا ہے۔ لیکن اگر معاشرہ میں چند افراد بھی ایسے موجود نہیں تو پھر ہمیں ان پریشانیوں کو برداشت کرنا پڑے گا۔ قوموں کی اصلاح تو قربانیوں سے ہوا کرتی ہے۔

---

(۱۱)

محمد احمد

صدرِ محترم و معزز سامعین! اس وقت انسانیت کا دیدہ ترسیہ خواب ہے ۔۔۔ تاریخ آج تک ایسی بے بسی، بے خوابی اور ایسے لاچار شعور سے دوچار نہیں ہوئی۔ انسانیت کا واسطہ نہیں پڑا۔ ایسے خلفشار سے کہ تہذیب و تمدن کے

بامِ عروج پر پہنچنے کے دعوے بھی ہوں اور جنگل کے قوانین کی پیروی بھی ـــــ ابنِ آدم امن عالم کا داعی بھی ہو اور شہروں، بستیوں پر بموں کی بوچھاڑ بھی کر رہا ہو۔ سارے جہاں کا درد اپنے جگر میں جمع کر کے کروڑوں بے گناہ بچوں، بوڑھوں، جوانوں، مردوں، عورتوں کی مسکراہٹیں، نوحوں، فریادوں، اشکوں، آہوں اور کراہوں میں تبدیل کئے جا رہا ہو۔ زمین کی تخلیقی قوتوں پر قابو پا کر دوسروں کو ضروریاتِ زندگی سے محروم اور ملکیتی حدود قائم کر کے اپنے ہی بھائیوں کو روٹی کے ایک ایک ٹکڑے کا محتاج کئے جا رہا ہو ـــــ

معزز خواتین و حضرات! یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ جہاں سائنسی کمالات نے زمانے کو حیرت میں ڈال رکھا ہے وہاں ہر قوم اپنے ہی پیدا کردہ دامِ فریب کے تاروں میں الجھی ہوئی ہے۔ دو عالمگیر جنگوں کی تباہی کے بعد تیسری جنگ سے بچاؤ کی جتنی تدبیریں کی جا رہی ہیں وہ تباہی و بربادی کے اس دلدل کی گہرائیوں میں اتارے جا رہی ہیں ـــــ ہزاروں دل و دماغ اس موت انگیز صورتِ حال پر طلسمِ پیچ و تاب بنے ہوئے ہیں۔ لیکن اس کشمکش سے نجات پانے کی کوئی راہ دکھائی نہیں دیتی ـــــ؟

صدرِ محترم! جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا ہے کہ اس وقت انسانیت ایک عجیب خلفشار سے دوچار ہے ـــــ تہذیب و تمدن کے آنگن میں وحشت و بربریت کا عفریت ناچ رہا ہے ـــــ شہروں کے شہر تہس نہس ہو رہے ہیں۔ ملکوں کے ملک ہولناک ویرانیوں میں بدل رہے ہیں ـــــ شرفِ انسانی کے اس قتل میں دنیا کے مہذب ترین لیڈر برابر کے شریک ہیں۔ اور جب اقوامِ عالم کی امامت کے دعوے دار وحشت و بربریت کے اس مقتل میں خون آلود خنجر لئے کھڑے ہوں تو شرفِ انسانی کو اس وحشت اور خونخواری سے نجات کون دلا سکتا ہے ـــــ؟

یہ سبھی کیوں ہے، کیا ہے، مجھے کچھ سوچنے دو
کون انسان کا خدا ہے، مجھے کچھ سوچنے دو

ایسا کیوں ہوا؟ یہ سب کچھ کیسے ہو رہا ہے؟ اور اس کے نتیجے میں کیا کچھ سامنے آئے گا۔ دنیا کا بڑے سے بڑا فلسفی بھی ان سوالات کے جواب میں کسی کو مطمئن کرنے کے قابل نہیں پاتا۔ آخر ایسا کیوں ہے

یہ سوال ہزار مایوس کن سہی۔ نوعِ انسانی کا مستقبل کس قدر بھی بھیانک کیوں نہ دکھائی دے رہا ہو۔ لیکن یہ ایسا نہیں کہ انسان کی سیہ بختیوں کی مستقل تقدیر بن کر رہ جائے ـــــ نوعِ انسانی کی تقدیر بارہا مایوسیوں کی اس تاریکی میں ڈوبی ہے۔ تاریخِ انسانی کے ابتدائی دور میں ان تاریکیوں میں اُجالا پیدا کرنے کے لئے حیثیتِ خداوندی کا پروگرام یہ رہا کہ نبوت و رسالت کا کوئی نہ کوئی حاملِ جلیل وحی کی روشنی لے کر نمودار ہوتا رہا اور روشنی کی یہ قندیلیں تقدیرِ انسانی کے افق پر جلوہ بار ہوتی رہیں ـــــ لیکن جب ذہنِ انسانی اپنی بلوغت کو پہنچ کر مستقل اور ابدی سہاروں سے کام لینے کے قابل ہو گیا تو آخری وحی کی وساطت سے رشد و ہدایت کی یہ مستقل قندیلیں قیامت تک کے لئے کتاب اللہ میں محفوظ کر دی گئیں ـــــ اس کتاب کی وارث جماعتِ مومنین کا بنیادی فریضہ یہ تھا کہ تاریخِ انسانی کے ہر نازک موڑ پر کتاب اللہ کی روشنی میں اقوام و ملل کی رہنمائی اور امامت کا فریضہ ادا کرتی رہے ـــــ اور اس طرح انسانیت کے جہنم کی طرف اُٹھتے ہوئے قدم رُک جائیں۔

لیکن ـــــ معززسامعین ! یہ نہ صرف نسلِ انسانی کی سب سے بڑی بدنصیبی تھی بلکہ یہ تاریخِ انسانی کا سب سے بڑا المیہ تھا کہ ایک قوم مسلمانی کے پُرفریب دعوے کے ساتھ اس عالم آرا ضابطۂ رشد و ہدایت کی اجارہ داربن کر نہ صرف خود اس کی روشنی سے محروم ہو گئی بلکہ اس ناروا تسلط کے باعث پوری نوعِ انسانی کو بھی اس کے لطف و کرم سے بے نصیب کر کے رکھ دیا ـــ اور آج اس کتاب کے زوال پذیر وارثوں اور شکست خوردہ اجارہ داروں کو ذل و شکست کی تاریکیوں میں ٹھوکریں کھاتے دیکھ کر کوئی بھی اس کتابِ جلیل سے راہ نمائی پانے کے لئے تیار نہیں ـــــ ہو بھی کیوں ؟ جو "اسلام" صدیوں سے بھوک ننگ اور بے آبروئی کے سوا کچھ نہ دے سکا۔ جو چین کے دہریوں جیسی اخلاقی دیانت نہ سکھا سکا - جو "ویت نام" کے کافروں جیسی قربانی اور جانثاری عطا نہ کر سکا ـــــ جو لوری موجودہ اسلامی دنیا سے ماوزے تنگ ' چاؤ - این - لائی اور ہوچی منہ کے پائے کا ایک بھی صاحبِ کردار راہ نما نہ پیدا کر سکا ـــــ کیا وہ اسلام اس قابل ہے کہ کوئی دیانت دار انسان اس پر فخر کر سکے ـــــ مسلمانوں کی صدیوں کی اجتماعی اور انفرادی بداعمالیوں کا ذمہ دار اسلام نہیں تو پھر اور کون ہے ـــــ ؟

صدرِ محترم ! یہ میری تہذیب کا المیہ ہے - یہ میرے دَور کی پکار ہے ـــــ یہ میری نسل کا نوحہ ہے یہ مایوسی و ناامیدی کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈوبی ہوئی نسل کا آخری سوال ہے - اس کا جواب ہمیں تلاش کرنا ہوگا اور اس سوال کا کھُل کر جواب دینا ہوگا ـــــ

معزز خواتین و حضرات ! آج ہم جب اپنی اس ذلت و خواری اور بے آبروئی کا سراغ لگاتے ہوئے اپنی تاریخ کے اوراق الٹتے ہیں ، تو ہمیں اس مجرم کا سراغ ملتا ہے جس نے ہماری زندگی کی بنیادیں ہلا کر رکھ دیں ـــــ ہماری تاریخ ببانگِ دھل بتائے گی اور قرآن کے حقائق اس کی بھرپور تائید کریں گے کہ ہم جس صورتِ حال کا شکار ہیں اس کی بنیادی وجہ وہ ملوکیت ہے جس نے پہلے منصبِ خلافت پر قبضہ جمایا اور پھر مذہبی پیشوائیت کے لات و منات وضع کر کے قرنِ اوّل کے نبوی اسلام کو اس خودساختہ مذہب میں تبدیل کر دیا جو صدیوں سے آکاس بیل کی طرح اُمتِ مرحومہ کے فکر و عمل کی توانائیوں پر مسلط ہے ـــــ ہاں ـــ اس مذہب نے ببانگِ دھل خدا کے سچے دین کی عزت و حرمت لوٹی اور خدا کی وہ جنت جس کی آرزو میں صحابہ کبارؓ تلواروں کے سایہ میں کلمہ پڑھتے تھے - تیروں سے چھلنی چھلنی ہو جاتے تھے اور دریاؤں ، پہاڑوں اور سمندروں کی بلندیوں اور پستیوں میں اسلام کی جہاں آرائی کا پرچم بلند کرتے زندگی بھر ایک لمحہ چین جیسی نصیب نہ ہوا - خدا کی وہ جنت اس انوکھے مذہب نے جمعرات کی باسی روٹیوں اور گدی مسواکوں تک کے عوض فروخت کی - ایک وقت کی مسواک کو ستائیس شہیدوں کی شہادت کا درجہ دیا - ہیضے اور طاعون سے مرنے والے شہیدوں کے مقام تک پہنچائے گئے ـــــ خانقاہوں کے بھنگی اور چرسی اس جنت کے سودے بازی کے لئے خدا کے ایجنٹ قرار پائے ـــــ خدا کا دین شخصیت پرستی کی بیخ و بن اکھیڑنے آیا تھا لیکن یہاں شخصیتوں کو (معاذ اللہ) خدا سے بڑھ کر درجہ دیا گیا - انہوں نے ازجل اور بالخصوص خدا سے بزرگ و برتر کر کے ساتویں آسمان کے عرش بریں تک بٹھا کر "الوہیت کے پیران کرسی" کو اس کے تمام مقام بنا کر "وحدت شہود" اور "وحدت الوجود" کے نئے نئے فلسفے ایجاد کئے گئے - خالقِ باری کی توحید

"ہمہ اوست" اور "ہمہ از اوست" کے عجمی تصورات میں بٹ گئی۔ الغرض دینِ حق کا حسنِ عمل تاریخ کا افسانہ بن کر رہ گیا اور اس کی جگہ عملی دنیا میں ملوکیت کی شعبدہ بازیوں نے لی۔ اور اس کا نتیجہ ــــ

باقی نہ رہی تیری وہ آئینہ ضمیری
اے کشتۂ سلطانی و ملائی و پیری

ملوکیت کی اس سلطانی و ملائی و پیری کی ہمہ گیر سازش سے آج تک اُمت کو نجات نہیں مل سکی۔ یہ عشوہ طراز نت نئے چولے بدل کر عالمِ اسلام کو مبتلائے فریب کرتی چلی آئی ــــ مغربی جمہوریت کے ڈنکے بجتے دیکھے تو اس نے ہمارے ہاں جمہوریت کا لبادہ اوڑھ لیا۔ اس کے جانشین کبھی پارلیمانی جمہوریت، کبھی بنیادی جمہوریت، کبھی صدارتی جمہوریت کے نئے نئے شاہکار کے کر ہنگامہ آرائے بزم ہوئے لیکن خوئے ملوکانہ پردۂ ساز پر گنگنائی سنائی دی کہ ــــ

ہم نے خود شاہی کو پہنایا ہے جمہوری لباس
جب ذرا آدم ہوا ہے خود شناس و خود نگر

اس نے سوشلزم کی چشمکِ ناز کی کار فرمائی دیکھی تو عرب سوشلزم، جمہوری سوشلزم اور اسلامی سوشلزم کی نزاکتیں ساز مسلم ممالک میں بھی فردوسِ گوش بننے لگی۔ اور پاکستان میں انقلاب انقلاب کی آوازیں گونجیں۔ برسوں کی پسی ہوئی قوم نے بھوک و افلاس کے ہاتھوں تنگ آ کر اسی انقلاب کا ساتھ دیا۔ مگر

نہ وہ بدلے نہ دل بدلا نہ دل کی آرزو بدلی
میں کیوں کر اعتبارِ انقلابِ آسماں کر لوں

معزز سامعین! اس وقت پاکستان بلکہ پورا عالمِ اسلام اپنی تاریخ کے ایک نازک موڑ سے دوچار ہے۔ اسلام کا مستقبل بیک وقت اس کے نادان دوستوں اور دانا دشمنوں کی کشمکش باہمی کی زد میں ہے۔ ہماری سیاسی قیادت کے منہ اپنے ۲۴ سالہ مجرمانہ کردار کا پشتارہ کندھوں پر اٹھائے دوسروں کی عیب جوئی اور اپنی پاکبازیوں کی افسانہ تراشی میں بد دیانتی کی پست ترین سطح پر پہنچ گئے ہیں ــــ ان حالات میں مستقبل کی امیدوں کی تازہ ترین کرن ہماری ابھرتی ہوئی نئی نسل کو بننا تھا مگر اسی نئی نسل پر جو کچھ بیتی وہ بڑے بوڑھوں کی بد قماشی سے کہیں بڑھ کر دلدوز و جگر سوز ہے۔

یہ نسل جس نے دوسروں کی امامت کے فرائض سنبھالنے تھے۔ اس سے ان ابھرتے ستاروں سے حکومت کے نصابِ تعلیم اور نظامِ تعلیم کی گھٹاؤں نے پہلے سوزِ تمنا کی حرارت اور تب و تابِ زندگی چھین لی۔ انہیں جذبِ دروں تک سے محروم کر دیا۔ یہ لوگ اسی الوہی تعلیم کے صدقے اپنے راہ و منزل تک سے بے نصیب ہو کر رہ گئے۔ ان عقابوں کے پاس صرف جذبات کی تند جولانیاں باقی رہ گئیں۔ جذبِ دروں اور ذوقِ پرواز سے محروم ہو کر ان کے بازو سمٹنے لگے تو کارگہِ سیاست کے شکاریوں نے ان کے جذبات کی گرما گرمی کو کام میں لانے کے لئے اپنی کمندیں اور جال پھینکنے شروع کر دیئے ــــ جب منزل سامنے نہ ہو تو پھر سفر آوارگی کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ یہی کچھ ہماری نئی نسل کے ساتھ ہوا کہ وہ آوارگی پر اتر آئے جس سے تاریخ کا رُخ تو ضرور بدل گیا لیکن منزلِ مراد ــــ؟

یہ ہماری تہذیب کا المیہ اور میری نسل کا نوحہ ہے ــــ کہ ہنگامہ بازیوں کا گرد و غبار چھٹ جانے کے بعد لا الٰہ

کی منزل کے راہی اپنے مقصودِ زندگی سے اور دُور ہٹ گئے اور اب جو آنکھیں مل کر دیکھتے ہیں تو

آگ بجھی ہوئی اِدھر، ٹوٹی ہوئی طناب اُدھر

معزز خواتین و حضرات! نئی نسل کی صحیح صحیح تعلیم و تربیت اور نشو و ارتقا کے لئے ارضِ پاک کی آزاد فضا میں کسی صاحب ضربِ کلیمؑ کی ضرورت تھی جو آزادی کے فوراً بعد ہر سیاسی ہاؤ ہو سے دامن بچا کر انہیں اپنی آغوشِ تمنا میں لے بیٹھتا۔ ان شاہین بچوں کو ان کی کھوئی ہوئی منزل عطا کرتا ـــــ زندگی کے مقصود و منتہا کی خبر دیتا ـــــ اس مقصودِ زندگی کے لئے جذبۂ صادقہ اور ذوقِ پرواز سے مالا مال کرتا ـــــ آخری نبیؐ کی آخری اُمت کے یہ جیالے شاہباز زندگی کی فضائے بسیط میں جھپٹنے پلٹنے اور پلٹ کر جھپٹنے کی عقابی تب و تاب سے بہرہ ور ہوتے اور وقت آنے پر پُرانے ستاروں کی جھلملاتی ہوئی روشنی میں نور و نکہت کی نئی تابانیاں پھیلا دیتے ـــــ ارضِ پاک خدا کے نور سے جگمگا اٹھتی۔ اس روشنی میں زندگی کی پُرپیچ راہیں اُبھر اور نکھر کر اندھی اور بہری قوم کے سامنے آجاتیں درسگاہوں سے ایک ایک ذرہ گوہرِ تابدار بن کر باہر آتا ـــــ غریب اور محتاج قوم اپنے خزینۂ حیات کو ان قیمتی موتیوں سے مالا مال پاتی ـــــ اس کی صدیوں کی حسرتیں اور ارمان پورے ہو جاتے ـــــ اس کی مدتوں کی بگڑی بن جاتی۔ ـــــ ماضی کے غم نشان مل جاتے ـــــ مستقبل کی منزلِ مراد کا سراغ مل جاتا ـــــ ہاں! فریبِ مسلسل کی ماری ہوئی یہ قوم ایک بار پھر زندہ ہو جاتی اور زمین و آسمان میں اس کی عظمتِ رفتہ کی باز آفرینی پر تحسین و تبریک کے نعرے گونج اٹھتے ـــــ

لیکن آہ ـــــ کسی نے بھی حکومتی اور اجتماعی سطح پر باز آفرینی کے اس راز کو نہ سمجھا اور جس فردِ واحد نے سمجھا اس کی مسلسل عرق ریزیوں اور شبانہ محنتوں کا صلہ کفر کے فتووں کی صورت میں دیا۔ مگر وہ مردِ خود آگاہ - دانا و بینا۔ موجِ حقا کے نقوشِ قدم پر چلتا اپنوں اور بیگانوں کے لگائے ہوئے زخم سہتا مسلسل آگے بڑھتا رہا ہے ..... مخالف قوتوں کی برق رفتاری اور سیلابِ بلا انگیز روشنی کے اس مینار کا کچھ نہ بگاڑ سکیں ـــــ

وہ مردِ درویش جس کو حق نے دیئے ہیں اندازِ خسروانہ

صدرِ محترم! میں پھر کہوں گا اور ببانگِ دُھل کہوں گا کہ یہ میری نسل کا نوحہ ہے کہ جب بھی صاحبِ ضربِ کلیم قوم کو خدا فریبیوں اور خود فریبیوں کے خوابِ شیریں سے جھنجھوڑنے کی کوشش کرتا ہے تو

پھر سُلا دیتی ہے اس کو حکمراں کی ساحری

نئی نسل کے نوجوانو! ہمارا سوزِ آرزو اور جذبۂ صادقہ آج آپ سے صرف اس لئے مخاطب ہے کہ آپ جس راہ پر سرپٹ دوڑے چلے جا رہے ہیں اس راہ پر زندگی کی کسی منزلِ مراد کا بھولا بھٹکا امکان نہیں ـــــ یہ راستہ ایسی خطرناک گھاٹیوں اور ہولناک غاروں کی طرف لئے جا رہا ہے جن کی بھول بھلیوں اور پیچ و خم میں آپ کی توانائیوں کو اپنی حسرتوں اور ارمانوں کی آخری ہچکیوں کے سوا کچھ میسر نہیں آئے گا اور یہ ہچکیاں اس قوم کے لئے بھی پیغامِ موت بن سکتی ہیں ـــــ میرے دوستو! جس فضا میں ہم بس رہے ہیں اس میں منزلِ مراد کا انعام فکر و بصیرت کی صحت مندی، وہ راست بینی اور روشن ضمیری بھی چاہتا ہے۔ نری خود سری، تند جولانی، ہنگامہ خیزی، اور شورشِ انقلاب کسی منزل تک پہنچانے کی ضمانت نہیں بن سکتیں۔ اور جو متذکرہ خصائص اس کی ضمانت بن سکتے ہیں ہمارے بازارِ سیاست میں ان کا چلن نہیں۔

ساتھیو! تم نے سیاسیات کی ہنگامہ خیز راہوں کا بخوبی تجربہ کر لیا۔ اس کا انجام اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا۔ جو لوگ اپنی پھیلائی ہوئی شورشِ انقلاب پر قابو پانے کی یا اس کا رُخ تعمیری اور مثبت شاہراہ کی طرف پھیرنے کی صلاحیت سے یکسر محروم ہوں ان سے کوئی اُمید رکھنا جیتے جاگتے حقائق کی نفی ہے ـــــ ان کی اشتعال انگیز اور منافرت خیز سیاست بازی سوائے جہنم کے شعلوں کے اور کچھ عطا نہ کر سکی اور نہ آئندہ کر سکے گی ـــ تمہیں اپنے سیرت و کردار کی صحیح صحیح تربیت اور تعمیر کی ضرورت ہے ـــ اور یہ ضرورت قرآن کے پیش کردہ اصول و مقاصد کے سوا کسی اور بارگاہ سے پوری نہیں ہو سکتی۔ اس کے لئے تحریک طلوع اسلام ہی وہ واحد تحریک ہے جو صرف قرآن کی مستقل اقدار کی چوکھٹ پر سر جھکانے کی تعلیم دیتی ہے۔ قرآن ہی ہمارے مسائل کا حل پیش کرتا ہے ـــ قرآنی اقدار کو اپنا کر ہی انسانیت سکھ کا سانس لینے کے قابل ہو گی ـــ اسی کے نظریہ کے پیشِ نظر ہمیں تحریک طلوع اسلام کے اصول و مقاصد کو قریہ قریہ اور گھر گھر متعارف کروانا ہے۔ ہمیں کوششِ پیہم سے اس جہنم زار کو گلزار بنانا ہے ـــ یہ ٹھیک ہے کہ کوششِ پیہم کے درخشندہ نتائج تو اس وقت سامنے آسکتے ہیں جب مفکر قرآن قوم کے شاہین بچوں کو سیاست کی آلودگی سے بچا کر اپنی آغوشِ تمنا میں لے کر بیٹھے اور اپنی درسگاہ میں ان کی تعلیم و تربیت کا انتظام کرے۔ وہ درس گاہ جس کی آرزو میں اس کی رات کی نیند اور دن کا چین ختم ہو چکا ہے۔ جب تک وہ درسگاہ قائم نہیں ہوتی ہماری سعی پیہم کا نتیجہ اس اعتراف کے سوا کچھ نہیں ـــ کہ

مانا کہ اس زمیں کو نہ گلزار کر سکے
کچھ خار کم تو کر گئے گذرے جدھر سے ہم

اس درس گاہ کے قیام کا وقت اب قریب آپہنچا ہے۔ اور اس طرح ہم بھی اپنی منزلِ مراد کے قریب پہنچ رہے ہیں اب مایوسی کے بادل چھٹ جانے والے ہیں۔ اس لئے

نہ ہو نومید نومیدی زوالِ علم و عرفاں ہے
کیونکہ
نگاہِ مردِ مومن ہے خدا کے رازدانوں میں

خالد سلام

(۱۲)

محترمہ صدر، خواتین و حضرات!

پاکستان میں، اس سے پہلے، اس بات کے متعلق کہ کیا صحیح ہے اور کیا غلط، کبھی اتنی شدید ذہنی انتشار کی کیفیت نہ تھی ـــ آج زیادہ سے زیادہ تعداد میں نوجوان پوچھ رہے ہیں کہ اس معاشرے نے ہمیں دیا کیا ـــ اور جواباً کوئی بھی پُر اُمید مستقبل کی تصویر کشی نہیں کر پاتا۔

جو تصویر ذہنوں میں اُبھرتی بھی ہے، وہ خوف، ایک بکھرتے ہوئے کلچر، ایک ٹوٹتے ہوئے پاکستان اور مایوسی کی ہے ـــ ہماری سیاست، آرٹ، ادب اور موسیقی میں تضادات۔ کشمکش، منافقت، جھوٹ، غلط فہمیاں اور غیر انسانی شعور ہے۔ عوام کو تو مہنگائی اور (INFLATION) کے عفریت نے ڈس لیا ہے، لیکن تاثر یہ دیا جاتا ہے کہ ملک میں اسلامی مساوات کا نظام لاگو کر دیا گیا ہے ـــ پاکستان بننے

پر جتنے بلند بانگ دعاوی کئے گئے تھے، ہر محراب و منبر اور سیاسی سٹیج سے وہ دُہرائے جاتے ہیں، ان کے باوجود زندگی کی قدر و قیمت میں اضافہ ہوتا تو درکنار، وہ دن بدن گرتی چلی جاتی ہیں۔ سانچیو اسوابہ کاری کے پیمانوں سے نلپئے تو کتنی ترقی ہوئی۔ "۲۲ خاندان تک سبنے۔ لیکن کچھ گھٹتے، کچھ ہارنے کا احساس شدید ہوتا چلا گیا۔ پاکستانیوں کے دل ایک دوسرے سے دُور ہوتے چلے گئے۔ مزدور اپنی محنت کے ماحصل سے کٹتا چلا گیا، اور انسان، انسان سے ——— لیکن یہ کیفیت صرف مزدور، کسان یا عوام تک محدود نہیں۔ بلکہ اس میں قدرے خوشحال درمیانہ طبقہ، کہ جس طبقے سے انقلاب اپنے ہراول دستوں کی تشکیل کیا کرتا ہے، وہ بھی اسی قدر زندگی سے، اور اپنے آپ سے کٹا ہؤا اور بجھا بجھا سا رہتا ہے۔ اس طبقہ کے مرد ہوں یا عورتیں، سب طمع اور خوف کے بھیانک ویلنے میں سرگرداں ہیں۔ اس ساری کیفیت سے نوجوان نسل خاص طور پر اثر پذیر ہوئی ہے، اور احترامِ آدمیت کی تمام راہیں بند ہو جانے سے ان میں خود زندگی سے بیزاری بڑھ رہی ہے۔ غرض کہ کی صورتحال مُردنی کی صورت حال ہے ——— نتیجہ یہ کہ خود پاکستان ہی میں ان کی دلچسپی ختم ہوتی جا رہی ہے ——— یہ نہیں کہ وہ غلامی پر رضامند ہو گئے ہیں۔ ان کے لئے غلامی اور آزادی میں فرق کرنا مشکل ہو رہا ہے، اور یہ عدم دلچسپی وبا کی طرح زندگی کے ہر گوشے پر چھا رہی ہے۔ نوجوانوں کے صرف جسم ہی نڈھال نہیں ہوئے ان کی روح کو بھی مُردہ کر دیا گیا ہے۔ ان کی آنکھوں میں تیرتے ہوئے خوفناک خلار، ان کی اندرونی بے حسی کا واضح اشارہ ہیں۔ ایسی بے حسی! یہ بہت بڑی قیمت ہے جو نئی نسل کو اپنے اسلاف کی غلطیوں کی پاداش میں ادا کرنی پڑ رہی ہے۔ یہ ویسی ہی مایوس کن صورت حال ہے جس میں حضرت ابراہیمؑ جیسا اولوالعزم پیغمبر یہ پکار اٹھا تھا کہ بار الہا! مجھے بتا کہ تو مُردوں کو کس طرح زندہ کرتا ہے! ←

معذرت

ماہ جولائی ۱۹۷۲ء کے شمارہ طلوع اسلام میں جلد بندی کے دوران، غلطی سے بعض کاپیوں میں صفحات ۴۱ تا ۵۸ لگنے سے رہ گئے یا غلط ترتیب میں لگے جن خریداران کی طرف سے ہمیں تا حال شکایات موصول ہوئی ہیں انہیں دوسرا پرچہ ارسال کر دیا گیا ہے۔ اور ہم تمام قارئین سے معذرت خواہ ہیں جنہیں دفتر کی مذکورہ غلطی کا باعث کوفت ہوئی ہو۔

(ناظم ادارہ طلوع اسلام)

صورتِ حال سادہ نہیں رہی بڑی پُرپیچ ہو چکی ہے۔ اب صرف افراد کی اور کبھی معاشرے کی نفسیات سمجھنے سے کام نہیں چلے گا۔ اب انسانیت (اور انسان) کی نفسیات کی بات کرنا ہوگی۔ نئے ناولوں سے ڈھونڈنا ہوگا کہ سوسائٹی اور افراد کا دراصل آپس میں رشتہ کیا ہے۔ زندگی کے زیادہ وسیع اور گہرے معانی کو زیرِ غور لانا ہوگا۔ صرف میکانکی نظریہ حیات اب کام نہ دے گا۔ "انسان" کسے کہتے ہیں اس کا فیصلہ کرنا ہوگا۔ یہ کوئی آسان کام نہیں ـــــ لیکن یہ سب کچھ شروع ایک بڑے سادہ طریقے سے کیا جا سکتا ہے۔ جسے "سوچا کرو" کا طریقہ کہا جاتا ہے۔

آیئے سوچیں کہ ۱۹۷۱ء کے سانحہ کے بعد اس قدر شدید مایوسی کا شکار ہو جانا کہیں اس وجہ سے تو نہیں کہ ہماری سوچ ہی کی عمارت پُرفریب منطق پر کھڑی کی ہوئی ہے ـــــ ہم اس کو نظریئے اور آئیڈیالوجی کی شکست سمجھ بیٹھے ہیں۔ حالانکہ اس نظریے کو تو صرف الفاظ تک ہی محدود رکھا گیا تھا اور رکھا جا رہا ہے۔ ۲۶ سال سے ہم نے "دو قومی نظریے" کے ایک ڈاکٹری نسخہ کو تعویذ سمجھ کر گلے میں لٹکا چھوڑا ہے ـــــ آئیڈیالوجی کے ساتھ تو یہ کیا! ـــــ اور عملاً وطنیت کی بنیادیں جغرافیہ، کلچر، زبان، رنگ، نسل پر رکھ دیں، تو کیا اس سے خوف اور حزن سے آزادی کا وہ نتیجہ پیدا ہو جاتا جس کی خوشخبری قرآن نے دی تھی، ـــــ یہ تو "کائناتی قوانین" کو چیلنج تھا، وہ تو کبھی کسی سے دھوکا نہیں کھا سکے۔ (OBJECTIVE) قوانین تو ایسے جھانسے میں نہیں آتے کہ کوئی قوم، افراد یا گروہ، محض خدا کا نام جپ کر ان قوانین کے ذریعے حاصل کی جانے والی خوش حالیاں، حاصل کر لے۔

محترمہ صدر! جیسا کہ آپ سب جانتے ہیں، قانون، اور جادو میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ ہم نے نسخے کو گلے میں لٹکا لیا، اور زہر سرایت کرتا رہا ـــــ جادو کا کوئی اثر نہیں ہوتا، لیکن قانون کا "جادوئی اثر" دیکھنا ہو، تو عملاً اس پر عمل کر کے دیکھئے ـــــ اور ہاں قانون کسی کی حسین آرزوؤں اور اُمنگوں کے تحت بدلتے بھی نہیں۔ اس میں تو خود کو بدلنا ہوتا ہے۔

لیکن ٹھہریئے! ایسا نہ ہو کہ بقول شاعر

پھر بھیانک تیرگی میں آ گئے
ہم گجر بجنے سے دھوکا کھا گئے

یہ لفظِ "قانون" اور پھر "قانون کے احترام" میں بھی ایک دھوکا چھپا ہوا ہوتا ہے۔ دورِ بربریت میں ظالم طبقات، مظلوموں اور محنت کشوں پر اپنے اقتدار کو خالص طبعی قوت کے بل بوتے پر ٹھونسے رکھتے تھے، لیکن دورِ تہذیب میں ایسی قوت کو "قانون" کہا جاتا ہے۔ ذرا سوچئے کہ جو "قانون" غاصبینِ محنت کا وضع کردہ ہوگا، وہ کس کے مفاد کا تحفظ کرے گا۔ میرے نزدیک وہ یقیناً غاصبوں اور لٹیروں کا محافظ ہوگا۔ اُن کی ڈھال ہوگا۔ ایسا قانون، جرائم کے انسداد کے لئے تو تدابیر اختیار کرے گا، لیکن جرائم کے محرکات اور اسباب و علل کو ختم کرنے کے لئے کچھ نہیں کرے گا ـــــ

ایک طرف تو ظالم طبقہ (سرمایہ داروں کا) قانون کے جال پھیلاتا ہے، اور دوسری طرف ارباب

مذہب کے ذریعے یہ عقیدہ عام کرتا رہتا ہے کہ امیری، غریبی، عزت و ذلت سب خدا نے اپنے ہاتھ میں رکھی ہے۔ اس کے لئے (معاذ اللہ) نہ کوئی قاعدہ ہے نہ قانون۔ اور مذہب کے معاملوں میں سوچنا بھی انسان کو جہنم رسید کر دیتا ہے۔ لہٰذا اس میں انسانی سوچ اور فکر کے لئے کوئی گنجائش ہی نہیں رہنے دی جاتی ـــــ یعنی ایک طرف سے معاشرے میں قانون، دھاندلی پر مبنی (ظالموں کا بنایا ہوا، ظالموں کے مفاد کا محافظ) اور دوسری طرف قانون ہی کی نفی ـــــ

اور یوں مل کر خوب ابہام اور (CONFUSION) پھیلائی جاتی ہے، تاکہ اندھیروں میں بھٹکتے رہو اور مایوسی خوب خوب پھیلے۔

سیاست والے قانون کا 'گجر' بجاتے ہیں تو مذہب والے 'اعلانِ سحر' بھی کرتے ہیں اور 'بیداریِ شب' بھی کراتے، لیکن ان سے ہوتا کیا ہے۔ مایوسی مزید بڑھتی ہے۔ اور ہر آدمی یہ کہتا نظر آتا ہے کہ ؎

بیداریِ شب کے بدلے ہم نے
دن پائے پر دھواں دھواں سے

بلکہ مزید یہ کہ ؎

عین ممکن ہے کہ 'اعلانِ سحر' کے باوصف
دوپہر کو بھی اندھیرا ہی اندھیرا ہوگا

مایوسی میں قوم ڈوبتی چلی جا رہی ہے۔ ۱۹۷۱ء کے سانحہ پر ساری قوم نے آنسو بہائے۔ ایسے محسوس ہوتا تھا گویا یہ آنسو ندامت کے آنسو ہیں۔ ندامت کے آنسو وہ ہوتے ہیں جن میں انقلاب چھپا ہوا ہوتا ہے، ان کو شانِ کریمی آگے بڑھ کر 'موتی سمجھ کر چُن لیتی ہے۔ لیکن شاید یہ ایسا نہ تھا؟ کیونکہ جوں جوں وقت گذرا، ایسا لگا گویا یہ آنسو شکست کے نہیں شکست پندار کے تھے، جن کے نتیجے میں مایوسی پھیل جاتی ہے۔ مایوسی کے رونے اور ندامت کے رونے میں بڑا فرق ہے، اور اس کو سمجھنے کے لئے قرآن میں دیا ہوا قصہ آدمؑ و ابلیس بڑا حقیقت کشا ہے۔

اس قصے میں قرآن نے بتایا یہ ہے کہ ابلیس، انسانی جذبات ہی کا نام ہے، جو مایوسی کا مظہر ہوتے ہیں، اور پیدا اُس وقت ہوتا ہے جب پُر فریب منطق کے تحت، انسان اپنے آپ کو اپنے عمل سے بری الذمہ قرار دیتا ہے۔ وہ ذمہ داری قبول کرنے سے انکار کرتا ہے اور کہتا ہے کہ اپنے فیصلے میں میں خود مختار نہ تھا، بلکہ یہ سب کچھ مجھ سے کروایا گیا تھا ـــــ

اُس پر، اُس سے کہا جاتا ہے کہ جب تک تم ذمہ داری قبول نہ کرو گے تم اپنے اس بنائے ہوئے زنداں میں محبوس رہو گے، اور چونکہ وہ اپنی انا کے ہاتھوں میں کھیل رہا ہوتا ہے اور اس طرح خود اپنے کو مجبور اور بے بس پیش کرتا ہے۔ لہٰذا، ہمیشہ کے لئے راندۂ درگاہ قرار پا جاتا ہے۔ اور اس سے اس پر ابدی مایوسی طاری ہو جاتی ہے۔

اس کے برعکس، جب آدمؑ سے لغزش ہوئی (اور لغزش کے امکان کو قرآن نے نظر انداز نہیں کیا) تو

آدم 'ندامت کے آنسو بہاتا اور یہ مانتا ہے' ربنا ظلمنا انفسنا' اے میرے نشوونما دینے والے' مجھ سے غلطی ہوگئی ہے! کیا میں ہمیشہ کے لئے راندہ درگاہ ہوں؟ اُسے سمجھایا گیا کہ 'کائناتی قوانین' کی حرکت کا تقاضہ ہے کہ جب تم نے اپنی غلطی کو تسلیم کرکے اپنے فیصلہ کی ذمہ داری کو قبول کیا ہے تو اس سے خود تم نے اپنے لئے فلاح کی راہیں کھول لی ہیں۔ اور اس طرح آدم پر کبھی ابدی مایوسی طاری نہیں ہوتی ـــــ روتا وہ ضرور ہے' لیکن لغزش کے خوفناک نتائج دیکھ کر ـــــ

حضرات! ماڈرن سائیکولوجی ایسی مایوسی کی صورتِ حال کو باطل نظام کا شاخسانہ قرار دیتی ہے۔ اس سے نکلنے کا راستہ یہ ہی بتایا جاتا ہے کہ

'ایک انسانیت ساز معاشرہ ہونا چاہئے کہ جس کا مقصد یہ ہو کہ اس کے تمام یا زیادہ سے زیادہ افراد کی مکمل نشوونما ہو سکے۔ اور نشوونما سے مطلب' انسانی ذات کے تمام پہلوؤں اور صلاحیتوں کی نشوونما اور (INTEGRATION) ہے۔

(KENNETH KENISTION IN UNCOMMITTED)

کینسٹن کہتا ہے۔ کہا جائے گا یہ خواب ہے۔ ایسا ممکن نہیں۔ لیکن اس کو نشانِ منزل کے طور تو (کسی قوم کے) سامنے رکھا جائے۔ تاکہ اس سے موازنہ کرکے' اپنی کوتاہیوں اور ناکامیوں کو ماپا جا سکے۔

اور قرآن نے بھی یہی بتایا ہے (اور پاکستان اسی لئے حاصل کیا گیا تھا کہ ثابت کیا جائے) کہ معاشرے کو ماپنے کا یہی ایک معیار ہو سکتا ہے کہ دیکھا جائے کہ اسکے افراد کی ربوبیت کس حد تک ہوئی ـــــ ان کی جسمانی نشوونما ہی نہیں' ان کی انسانی نشوونما بھی ـــــ

خواتین و حضرات! دراصل ہم نے جو جُرم کیا ہے اور جس کی سزا بھگت رہے ہیں' وہ ہے یہی کہ ہم نے انسانی ذات کے متعلق کبھی سوچا ہی نہیں، کہ اس ایک سوچ کو نہ سوچ کر کتنا بڑا انسانی ٹول (TOLL) ادا کیا ہے!

لہٰذا مایوسی سے نکلنے کے لئے "اپنے" متعلق سوچنا ہوگا' خود کو بدلنا ہوگا اور "قرآنی" قوانین کے مطابق کرنا ہوگا ـــــ یہ ہے ہادی اور رہنما اصول ـــــ

قرآن نے مایوسی سے بچنے کے لئے 'رحمت' کا قانون بتایا ہے اور رحمت کا مطلب بھی 'نشوونما' ہے۔ ایسی نشوونما نہیں جس سے عزتِ نفس مجروح ہو جائے' شرفِ انسانیت قائم رکھتے ہوئے نشوونما۔ جیسے رحمِ مادر میں بچے کے علم کے بغیر اس کی پرورش ہو رہی ہوتی ہے' پھر اس میں لچک اور لوچ بھی ہوتی ہے' سختی اور کرختگی نہیں ـــــ کیونکہ "انسان" کی ایک انسانی زندگی بھی ہوتی ہے۔ (VALUES) کی' اقدار کی ـــــ لہٰذا' انسان کی ضروریات بمقابلہ جانور' دو قسم کی ہونگی۔ طبعی اور عزوشرف انسانیت کی۔ یہ دونوں ملیں گی تو انسان کے سلسلے میں اُسے 'رحمت' کہا جائے گا ـــــ اور اگلی بات یہ کہ (یہودیوں کے عقیدے کی طرح) یہ رحمت کسی خاص نسل میں محدود نہیں۔ جو بھی یہ پیمانے اپنا لے' اس کو یہ رحمت (نشوونما کی زندگی)

مل جائے گی۔ (۹/۱۱)

لیکن جوان اقدار پر یقین نہیں رکھتے۔ اور پھر بھی سمجھتے ہیں کہ ایک حسین زندگی حاصل ہو سکتی ہے۔ وہ زندگی سے مذاق کر رہے ہیں، زندگی سے مذاق کیا خود اپنے آپ سے مذاق۔ انہیں منافقین کہا جاتا ہے۔ لہٰذا مایوسی سے نکلنے کے لئے پہلی شرط تو یہ ہے کہ منافقت سے نکلنا ہوگا۔

لہٰذا مجھے اپنے ساتھیوں سے کہنا یہی ہے کہ منافقت اور 'مذہب' کے دھوکے سے نکلو ۔۔۔۔۔ قرآنی قوانین پر غور و فکر کر کے دیکھو لو سمجھ میں آتے ہیں تو قرآن پر عمل پیرا ہو جاؤ۔ اور عمل کے نتائج کو اس 'ٹمٹمٹ' (یعنی نشو ونما) کے پیمانے سے ناپتے جاؤ۔ اور پھر دیکھو کیسے شاندار نتائج نکلتے ہیں۔ پھر نہ خوف ہوگا نہ حزن! ؎

شاید کہ اتر جائے تیرے دل میں میری بات

(۱۳)

طاہرہ حیدر

محترمہ صدر صاحبہ - محترم بابا جی - میرے بزرگوار اور عزیزو -

نظامِ عالم پر نظر ڈالئے تو معلوم ہوگا کہ ہر لحظہ کائنات میں ایک انقلابِ عظیم برپا ہے۔ صرف جمادات اور نباتات ہی کو لیجئے۔ جمادات اور نباتات کے ہر ذرے کی کڑیاں ایک دوسرے سے مربوط ہیں اور یہ ربط ایسا پائندہ و تابندہ ہے کہ یہ کائنات ہر لحظہ ایک نئی اور بہتر زندگی کی طرف رواں دواں ہے۔ یہ تحریک اس انہماک سے روبعمل ہے کہ اس تگ و دو میں کہیں بھی اور کسی حالت میں بھی ناامیدی اور یاس کا شائبہ تک نظر نہیں آتا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وَ اللّٰہ اور اَللّٰہ کا قانون اِن کوششوں کو پروان چڑھا رہے ہیں۔

هُوَ الَّذِیْ یُصَلِّیْ عَلَیْکُمْ وَ مَلٰٓئِکَتُهٗ لِیُخْرِجَکُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَی النُّوْرِ۔

اب خارجی کائنات کو چھوڑ کر ذرا اس خلیفۃ فی الارض پر نظر ڈالئے۔ جو کہ اس کائنات کی اہم ترین کڑی ہے۔ اس کی فتنہ سامانیوں کی بڑی بڑی گواہیاں موجود ہیں۔ فرعون۔ ہامان۔ قارون۔ بخت نصر۔ چنگیز۔ کون تھے یہ سب خلیفۃ فی الارض۔ مشرقی پاکستان میں جو کچھ ہوا تازہ ہی تو بات ہے۔ وہ کون سے عوامل تھے جس کے نتیجہ میں انسان، انسان کے خون کا پیاسا ہو گیا۔ اور جب تک معصوم بچوں کا خون چلوؤں سے نہ پی لیا اس خلیفۃ فی الارض کی پیاس نہ بجھی۔ آپ کچھ ہی کہیں۔ سیاسی بوجھ بجھکڑوں کی تانیں نامعلوم کہاں ٹوٹیں۔ شاید فلسفی عالم بے ہوشی میں کہیں دور کی کوڑی لائیں۔ لیکن میں یہ کہوں گی کہ یہ سب کچھ اس لئے ہوا کہ ہمارے اعمال میں ربط نہ رہا۔ تسلسل ٹوٹ گیا۔ نتائج آنکھوں سے اوجھل ہونے گئے اور قوم ناامیدی اور یاس کا شکار ہوگئی۔ مایوس تو ابلیس ہوا کرتا ہے۔ مایوسی پھیلانا اس کا حربہ ہے۔ قرآنِ کریم پر ایمان رکھنے والا کبھی مایوس نہیں ہو سکتا۔ راہ گم کردہ مسافر مایوس ہو کر بیٹھ جایا کرتا ہے جو خدا کے قوانین اور اُس کی صداقتوں سے انکار کرتے ہیں۔ وہ ہی اس کی رحمتوں سے مایوس ہوتے ہیں اور رحمت سے مایوس ہونا کفر ہے۔

ابھی کل ہی کی بات ہے۔ یہودیوں نے اپنے سے دس گُنا عربوں کا مار مار کر بھرکس نکال دیا۔ ابھی تو سینہ میں پُونی بھی نہیں کاتی گئی۔ ذرا اور چند دن انتظار کیجئے۔ اور دیکھئے کہ کیا ہوتا ہے۔ یاد رکھئے خدا کا قانون

مسلمان اور غیر مسلمان میں تمیز نہیں کرتا۔ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَتِہِ اللّٰہ کے سہارے جینے والی بے عمل قوم کا وہی حشر ہوگا جو بخت نصر کے ہاتھوں یہودیوں کا ہوا تھا۔ تاریخ، تاریخ ہے۔ تاریخ کے پہیہ کی رفتار کو روکا نہیں جا سکتا۔

آخر یہ سب کچھ کیوں ہو رہا ہے۔ وہی نامحرمی دل کی۔ وہی کڑیوں کی بے ربطی۔ لا تقنطو من رحمتہ اللہ کی بے عمل تسبیح پڑھنے والو۔ سُن لو۔ اور کان کھول کر سُن لو۔ آج جو حشر ہمارا ہو رہا ہے اس کے ذمہ دار تم ہو۔ آج کے پیشہ ور دانش ورو۔ آج تم قوم کے خون کی ہولی کھیل رہے ہو۔ تمہاری بے راہ روی۔ قانون شکنی، عہد فراموشی اور بدقماشی نے نئی نسل کو سرکش اور بیباک بنا دیا ہے۔ تم قوم کا خون بہا کر مگرمچھ کے آنسو رو رہے ہو۔ اور نوجوان نسل بغاوت کی راہ پر آگے ہی آگے بڑھ رہی ہے۔ اب بھی وقت ہے سنبھل جاؤ۔ تاریخ ہلی کا مطالعہ کرو۔ تاریخ اسلام کو دوبارہ قرآن کی روشنی میں مرتب کرو۔ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ پر ایمان لاؤ۔ نئی نسل کو بتاؤ کہ وہ کس آسمان کا ٹوٹا ہوا تارا ہے۔ زمین پر انسان کی کھینچی ہوئی لکیروں کو مٹا دو۔ اور کہو کہ ہم حدود تا آشنا قوم ہیں۔ اُس کلچر اور تہذیب کو جنم دو جس پر قوم فخر کر سکے۔ تاکہ نئی نسل کا دل نامرادی۔ نا اُمیدی اور یاس سے پاک ہو جائے۔ میرے دانشورو تم دیکھو گے کہ یہی قوم کتنے (GENIUS) جنم دیتی ہے۔ جن کی ذہانت اور فکانت قوم کو نئی زندگی سے روشناس کرا سکے گی۔ اور دنیائے سیاست کی بساط کو اُلٹ کر رکھ دے گی۔

خواتین و حضرات! میں اس تلخ نوائی کی معافی چاہتی ہوں۔ تاہم یہ ضرور عرض کروں گی کہ ہماری گراوٹ کا ذمہ دار ایک طبقہ اور بھی ہے۔ یہ طبقہ عنبر بیل سے زیادہ سرسبز و شاداب خوراک خود پیدا نہیں کرتا لیکن خوش خوراک ہے۔ لباس خود نہیں خریدتا۔ لیکن پھر بھی خوش پوشاک ہے۔ ماشاء اللہ صحت نہایت اچھی۔ عمر زیادہ۔ خوش فکر ہے اور بے فکر بھی۔ اور اس پر طرّہ یہ کہ یہود کے نبیوں سے افضل اور خدا کے قریب تر ہونے کا مدعی۔

اے سادہ ورقو۔ آؤ اور ہم سائنس والوں کے ساتھ ذرا لیبارٹری تک چلنے کی تکلیف گوارا کرو۔ ہم ہیں جو خدا سے باتیں کرتے ہیں۔ ہم ہیں جو خدا کو ہر لحظہ نئی آن اور نئی شان میں دیکھتے ہیں۔ ہر ذرّہ اور ہر ریشہ ہر وقت اپنی شکل اور ہیئت بدلتا رہتا ہے۔ اور بہتر شکل میں تبدیل ہوتا رہتا ہے۔ ہمیں "کن فیکون" کی صدائیں ہر جانب سے سنائی دیتی ہیں۔

یہ صحیح ہے کہ اللہ رحیم ہے۔ اللہ کریم ہے۔ اللہ خیر الرّازقین ہے۔ لیکن یاد رکھو۔ اللہ کی رحمت تمہارے تسبیح کے دانوں سے لٹکی ہوئی نہیں ہے۔ اللہ کا کرم تمہارے حجروں کی اندھیری فضا میں قیام پذیر نہیں ہے۔ اللہ کا قرب تمہارے نصیب میں کہاں۔ دعا میں اللہ کے قانون کو پکارا جاتا ہے لیکن تمہاری حالت تو یہ ہے کہ اپنے روزمرہ کے کام جو تمہیں خود کرنے ہوتے ہیں اُن کے لئے بھی خدا سے کہتے ہو کہ وہ کر دے۔ عادت سی ہے۔ اللہ کا قانون جامع ہے اور جامعیت کا تقاضا ہے کہ ہر عمل کا نتیجہ صحیح صحیح مرتب ہوتا چلا جائے۔ یہی ہوتا رہا ہے۔ ہوتا رہے گا۔ اور یہی منشاءِ الٰہی ہے۔

قرآن رحمت ہے اور رحمت سے مایوس ہونا کفر کہا گیا ہے۔ اور صدرِ محترم، اگر غلطیوں کا احساس ہو تو غلطی کی اصلاح بھی ہو سکتی ہے۔ اگر احساس ہی نہ ہو تو اصلاح بھی نہیں ہو سکتی۔ مایوس وہ ہو جس کے سب (CHANCES) ختم ہو چکے ہوں۔ ہمیں چاہئے کہ غلطی کا ازالہ کریں اور سینے میں وہ دل پیدا کریں جو قرآنِ خالص پر یقین رکھتا ہو۔ اللہ کے قانون کو ایک پودے سے تشبیہ دی جا سکتی ہے۔ پودے کے اعضاء کس طرح ایک دوسرے سے وابستہ ہیں۔ یہ رنگ و روپ اس پھول کو کس طرح ہری شاخوں نے عطا کیا ہے جڑیں کس طرح چھان پھٹک کر خوراک آگے بھیج رہی ہیں۔ کلیاں کس طرح اور کس منزل پر وجود میں آتی ہیں۔ ان کلیوں کے اندر سے رنگدار پھول جھانک رہے ہیں۔ یہ ہے اللہ اور اس کا قانون۔ جو جاری و ساری ہے۔ اور ہر لمحہ ہر ذرّہ اور ہر ریشہ اس امید پر اپنا عمل پیش کر رہا ہے کہ اس کا نتیجہ مرتب ہوتا چلا جائے۔

سائنس کی تجربہ گاہ ہی ایک ایسی جگہ ہے جس کا مشاہدہ کرکے ہر صاحبِ بصیرت بے ساختہ پکار اُٹھے:

فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ ؕ

اور خواتین و حضرات یہی ہے شرع میرے خیال میں مصرعِ ثانی کا کہ

امیدِ مردِ مومن ہے خدا کے رازدانوں میں

خلیل احمد (سیالکوٹ)

(۱۴)

صدرِ ذی وقار۔ معزز سامعین

آج جبکہ ہر طرف مایوسیوں اور نااُمیدیوں کے مہیب بادل ہمارے سروں پر منڈلا رہے ہیں اور ہماری قومی زندگی کے ہر شعبہ کو آہنی شکنجے میں جکڑ کر ہماری ملی جمیت کا مذاق اُڑا رہے ہیں، اور ہم ان مایوسیوں اور نا امیدیوں کی گھنگھور گھٹاؤں کے سامنے گھٹنے ٹیکے ہوئے لرزاں و ترساں ہیں تو طلوعِ اسلام کے سٹیج سے ایک بار پھر یہ آواز اُبھری ہے کہ مایوس ہونا زندہ قوموں کا شیوہ نہیں۔ مایوس وہ ہوا کرتے ہیں جن کے سامنے کوئی مقصدِ حیات نہ ہو۔ یا مایوس وہ ہوا کرتے ہیں جو راستے کے پیچ و خم میں اُلجھ کر منزل کے قریب ہونے کی بجائے اس سے دُور ہوتے جا رہے ہوں اور منزل کا کہیں دُور دُور تک پتہ نہ ہو اور نتیجۃً یہ بھٹکے ہوئے مسافر یا تو اپنی صحرا نوردیوں میں زندگی کا چراغ گل کر دیتے ہیں اور یا پھر اس سے راہِ فرار حاصل کرنے کی سعیٔ لاحاصل میں مزید گم راہ ہو جاتے ہیں۔

جنابِ صدر۔ آج اگر آپ دنیائے عالم پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالیں تو آپ دیکھیں گے کہ دنیا میں اخلاقی اقدار کا فروغ بالکل ناپید ہو چکا ہے۔ اور انسان انسانیت کے بلند ترین منصبِ حیات سے بہت نیچے گر کر ... حیوانی زندگی بسر کر رہا ہے۔ بلکہ قرآن کے الفاظ میں اس سے بھی بدتر۔ اب دیکھنے کی بات یہ ہے کہ انسان اس قدر تیزی سے سدرۃ المنتہیٰ کی بلندیوں سے گر کر "تحت الثریٰ" کی عمیق غاروں میں کیوں پھنس رہا ہے۔ وہ کون سے محرکات ہیں جو اس کے ذمہ دار ہیں اور یہ صرف ہماری قوم ہی نہیں بلکہ ایک بین الاقوامی مسئلہ ہے جس نے دُنیا بھر کے اربابِ فکر کو پریشان کیا ہوا ہے کہ ان حیوان نما انسانوں کو کس طرح سنبھالا جائے اور ان کی کشتیٔ حیات کو کس طرح سمندر

کی تلاطم خیزیوں سے بخیر و عافیت گزار کر ساحلِ مراد سے ہمکنار کیا جائے۔ لیکن یہ لوگ جس طرح چاہیں سوچیں، جس نہج پر بھی سوچیں ان کو جواب نفی میں ملے گا۔ ایسا کیوں ہے؟ صرف اس لئے کہ ان لوگوں کے خیالات نے آج کے انسان کو اس حد تک مجبور و مایوس کر دیا ہے کہ اس کی حالت قفس کے پرندے کی سی ہے وہ پھڑ پھڑا تو سکتا ہے لیکن آزاد نہیں ہو سکتا۔ وہ قفس میں مرغیِ خوانی تو کر سکتا ہے لیکن اس کی آواز مرغانِ سحر کی شیریں سے بالکل عاری ہوتی ہے۔ اور اس طرح گلا پھاڑنے کے بعد خود بخود خاموش ہو جاتا ہے۔ یہ ہوتی ہے جناب من ایک مایوس فرد کی حالت۔

صدرِ محترم! قطع نظر ان حالات کے جن کا اُوپر ذکر کیا گیا ہے آپ اگر تاریخِ انسانی کا بغور مطالعہ فرمائیں تو آپ پر یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہو گی کہ دنیا کے ابھی تک قائم و دائم رہنے کا انحصار کافی حد تک اُمید پر ہے۔ کیونکہ انسان جس دن اپنے آپ سے مایوس ہو گیا یعنی اس کے سامنے کوئی مقصدِ حیات نہ رہا۔ اس کی کوئی کرن باقی نہ رہی تو اس کی زندگی میں جمود طاری ہو جائے گا اور جب کسی فرد یا قوم پر جمود کی سی کیفیت طاری ہو تو وہ گھڑی اس کی موت کی گھڑی ہوا کرتی ہے۔ اس لئے کوئی بھی زندہ قوم خواہ وہ مصیبتوں اور تکلیفوں کے لق و دق صحرا میں پھنسی ہوئی کیوں نہ ہو۔ کبھی مایوس نہیں ہوا کرتی۔ کسی قسم کی ناامیدی کا شائبہ تک بھی ان کے دل پر نقش نہیں کر پاتا۔ وہ قوم وقت کی منہ زور آندھیوں کا مردانہ وار مقابلہ کرتی ہوئی حالات کا رُخ اپنی طرف موڑ لیا کرتی ہے۔ اور وہی وہ قوم ہوتی ہے جس کو دنیا میں اعلیٰ ارفع مقام حاصل ہوتا ہے۔

صدرِ گرامی! ہمارے ہاں عام طور پر یہ تاثر لیا جاتا ہے کہ صاحب چلو ہم تو مجبور ہیں یا مایوس ہیں اس لئے دنیا کی دوڑ میں پیچھے رہ چکے ہیں۔ لیکن اقوامِ مغرب تو مایوس نہیں۔ وہ اپنی تمام زندگی جان کاہ کوششوں میں مصروف کر دیتے ہیں اور کبھی مایوس نہیں ہوا کرتے۔ وہ زندگی کی تگ و دو میں شمعِ اُمید دل میں جلاتے ہمیشہ آگے ہی آگے بڑھنے میں مصروفِ کار ہیں۔ وہ اپنی ذاتی کوششوں کے نتیجہ میں اور خداداد صلاحیتوں کے بل بوتے چاند تاروں پر کمندیں ڈال رہے ہیں۔ اس لئے ان کے مایوس ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ لیکن اتنے پُراُمید ہونے کے باوجود گمراہ کیوں ہیں؟ وہ بھی ہماری طرح جہنم کے شعلوں میں جل رہے ہیں۔ اس وقت وہ بھی مایوسیوں اور نااُمیدیوں کے انہی راستوں پر بھٹک رہے ہیں جن پر ہم۔ یہ الگ بات ہے کہ ان کے ہمارے بھٹکنے کی وجہ مختلف ہے۔ لیکن بنیادی طور پر مایوسیوں نے ہم دونوں فریقوں کو بہت زیادہ حد تک نقصان پہنچایا ہے۔ اور فرق یہ ہے کہ وہ شاید کبھی بھی ان مایوسیوں سے چھٹکارا حاصل نہ کر سکیں۔ کیونکہ ان کے پاس کوئی ایسی کتاب بھی نہیں جو ان کی مایوسیوں کو پھر امیدوں میں بدل سکے۔ اور ان سے دل کی اتھاہ گہرائیوں سے مایوسیوں کے نشان مٹا دے اور ان کو اس قابل بنا دے کہ وہ زندہ قوموں کی طرح زندگی بسر کر سکیں۔ اور ہمارے بھٹکنے کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے پاس ان نااُمیدیوں کا علاج تو ہے۔ لیکن ہم اس کو قبول کرنے پر تیار نہیں۔ خداوند کریم نے ہمیں ایک کتاب عطا فرمائی ہے جس کے متعلق اس کا ارشاد ہے کہ یہ کتاب ہر لحاظ سے مکمل اور بالکل مکمل ہے۔ اب یہ ہمارے کرنے کا کام ہے کہ ہم اس میں سے اپنی مایوسیوں اور نااُمیدیوں کا حل ڈھونڈ لیں۔ لیکن بہت دُکھ سے کہنا پڑتا ہے کہ ہم نے اس کتاب کے احکامات کو پسِ پشت ڈال کر اپنے جذبات کا اتباع شروع کر دیا ہے اس لئے ہم بھٹک رہے ہیں۔ جناب صدر! ہمارے بھٹکنے اور مایوس ہونے کی مثالیں تو اس قدر ہمارے اردگرد

پھیلی ہوئی ہیں کہ ان کو آپ حضرات کے سامنے پیش کرنے کی چنداں ضرورت نہیں۔ اس لئے آج سے اس مختصر وقت میں اس بات کو واضح کرنے کی کوشش کروں گا۔ کہ آیا مغرب کی بربادی کی ذمہ دار مایوسی اور نا اُمیدی ہے یا کچھ اور!

عزیزانِ من! اگر آپ مغرب کے محققین کی عمر بھر کی عرق ریزیوں کا مطالعہ کریں تو آپ دیکھیں گے کہ ان حضرات نے انسان کو کس قدر مجبور و مایوس اور بے کس و ناتواں قرار دیا ہے۔ مثلاً ان کے (BIOLOGIST) حضرات کا خیال ہے کہ ہر انسانی بچہ اپنی سیرت و کردار کے تمام بنیادی خطوط اپنے باپ کے نطفۂ حیات سے مستعار لیتا ہے اور کسی میں اتنی ہمت نہیں کہ ان خطوط کو اِدھر سے اُدھر کر سکے۔ ان کے بعد (SOCIOLOGIST) آگے بڑھے اور فرمایا۔ "انسانی بچہ جس ماحول میں آنکھ کھولتا ہے۔ اس کے اثرات انسان کی تمام زندگی پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ اور کوئی بھی ان سے روگردانی نہیں کر سکتا۔ ان کے بعد (PSYCHOLOGIST) حضرات تشریف لائے اور فرمایا۔ کہ حضرت یہ آپ کس فکر و شعور کا نام لے رہے ہیں۔ انسان میں تو کوئی ایسی چیز ہے ہی نہیں صرف انسان (UNCONCIOUS MIND) ایک ایسی چیز ہے جو کہ انسانی زندگی کو کنٹرول کرتی ہے۔ اور سب کے آخر میں (ECONOMIST) حضرات نازل ہوئے اور گویا ہیں۔ "آپ لوگ کس فکر و شعور اور لاشعور کی فضول بحث میں اُلجھ رہے ہیں۔ انسانی زندگی پر صرف اور صرف ایک چیز اثر انداز ہوتی ہے۔ اور وہ ہے معاشی نظام جس قسم کا معاشی نظام ہوگا اسی قسم کا انسان ہوگا۔

غور فرمائیں جناب صدر کہ ان لوگوں کے خیالات نے انسان کو کس حد تک مجبور و مایوس قرار دیا ہے۔ ان لوگوں نے انسان کو کولہو کا بیل بنا چھوڑا ہے۔ ان کی سوچ کو صرف ان کی اپنی ذات تک محدود کر دیا ہے۔ اور اس سے ان کا نوجوان طبقہ مسلسل تباہی کی طرف بڑھ رہا ہے۔ گرامی قدر۔ اگر ان لوگوں نے فطرت کی قوتوں کو مسخر کر لیا ہے تو اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ وہ مستقبل کے بارے میں بہت پُر اُمید ہیں یا بالکل مایوس نہیں۔ کسی قوم کے پُر امید یا مایوس ہونے کا یہ پیمانہ نہیں کہ ہم اس کی مادی قوتوں کو دیکھیں۔ یہ تو بہت سطحی سی بات ہے۔ کسی قوم کے مایوس یا پُر امید ہونے کا پیمانہ صرف وہ فلسفۂ حیات ہے جس کے تحت وہ زندگی بسر کر رہی ہو۔ تو اس کے متعلق آپ نے دیکھ لیا کہ یہ لوگ انسان کو کس حد تک مجبور و مایوس قرار دیتے ہیں اور پھر اس بات کا رونا روتے ہیں کہ ہماری نئی پود مایوسیوں اور نا اُمیدیوں کی خطرناک دلدلوں میں پھنسی ہوئی ہے۔

یہ ہوتی ہے جناب من ایک مایوس قوم کی حالت جب مایوسیوں اور نا اُمیدیوں کے جھگڑوں میں اس کو آس کی کوئی کرن دکھائی نہیں دیتی تو وہ گمراہ ہو جایا کرتی ہے۔ ڈین انگ بھی یہی کہتا ہے کہ آج کا انسان شاہراہ حیات پر آنکھیں بند کئے اور منزل سے نا آشنا اِدھر سے اُدھر بھٹک رہا ہے۔ اور حقیقتاً جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا ہے کہ مغرب کے پاس کوئی ایسی روشنی ہے ہی نہیں جو انہیں منزل کا پتہ بتلا سکے۔ وہ اپنی طاقتور دُوربینوں اور خوردبینوں سے آسمان کی بیکراں وسعتوں میں تیرتے ہوئے چھوٹے چھوٹے ذرّات تو دیکھ سکتے ہیں لیکن اپنی اندرونی اندوہناک تاریکیوں سے بالکل ناواقف ہیں۔ (باقی)